تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہنامہ

مفاہیم

کراچی

اپریل ۲۰۲۱ء

جلد ۱

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

شمارہ ۶

لیتفقہوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

لیتفقہوا فی الدین

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

اقبال

من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین

ماہنامہ مفاہیم کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقّہ فی الدّین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

حافظ حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- حافظ سید اسامہ علی
- استاذ ابرار حسین
- استاذ عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

فہرست

اداریہ ۴

درسِ قرآن .... حماد احمد ترک ۷

درسِ حدیث .... ابن عباس ۱۰

الدنیا یوم ولنا فیه صوم .... حافظ عمیر انور ۱۲

حضرت شیخ الاسلام صاحب دامت برکاتہ کے ساتھ ایک یادگار نشست (۱) .... مولانا محمد اقبال ۲۴

تعارفِ امام غزالی (۱) .... حافظ مومن محمود ۳۰

الجماعہ کا مفہوم (۲) .... صوفی جمیل الرحمٰن عباسی ۳۷

القواعد الفقهية .... مفتی نذیر احمد ہاشمی ۴۵

اردو کے حروف تہجی .... ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ ۵۳

فتاویٰ یسئلونک .... دارالافتاء فقہ اکیڈمی ۵۶

اداریہ

سبقت الی الخیر

جوڑی بہت عمدہ تھی اور وہ دونوں رسولِ خدا ﷺ کے صحابی تھے۔ ایک ساتھ ایمان لائے اور ایک ساتھ ہی بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے۔ ان میں سے پہلا، دوسرے کی نسبت امورِ دین میں زیادہ محنت کرنے والا تھا۔ ایک غزوے کا موقع آیا تو ان کی جوڑی ٹوٹی۔ محنتی دوست نے شہادت کا رتبۂ بلند پایا، جبکہ ان کا جوڑی دار تنہا زندگی گزارتا رہا۔ ''بچھڑ کے لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے'' کے مصداق اگلے ہی سال طبعی موت پاکر یہ بھی راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ اللہ تعالی سچوں کو سچ دکھاتا رہتا ہے، چنانچہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو ان دونوں کے بارے میں خواب دکھایا گیا۔ کہتے ہیں کہ میں جنت کے دروازے پر کھڑا تھا اور وہ دونوں دوست بھی وہیں موجود تھے۔ اتنے میں جنت سے ایک بندہ نکلا اور اس نے اولاً، بعد میں وفات پانے والے دوست کو جنت میں داخلے کی اجازت دی، بلکہ اسے لے کر اندر چلا گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد نکلا اور پھر اس نے شہید کو جنت میں داخلے کا اذن دیا۔ صبح ہوتی ہے تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ لوگوں کو یہ خواب سناتے ہیں۔ دیکھیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بڑی تعداد نے اس خواب کو سنا۔ اگرچہ بعد میں رسول اللہ ﷺ نے اس خواب کی تصدیق فرما دی تھی لیکن ابھی تک وہ تصدیق سامنے نہیں آئی تھی لیکن اس کے باوجود، اس خواب کے سچے ہونے پر کسی نے شک وشبہے کا اظہار نہیں کیا، اس لیے کہ سچے، سچ کی جانچ اور سچے کی پہچان رکھتے ہیں۔ ہاں البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس خواب میں دکھائی جانے والی صورتحال پر متعجّب ضرور ہوئے۔ باعثِ حیرانی یہ تھا کہ طبعی موت مرنے والا شہید سے سبقت کیسے لے گیا۔ اصل میں یہ اجتہاد فی العبادت اور رمضان کی ریاضت کا صلہ تھا جو مرنے والے کو شہید سے پہلے جنت میں لے جانے کا ذریعہ بنا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی حیرانی کا اظہار ایک دوسرے کے سامنے ضرور کیا ہوگا، جبھی تو یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچی، آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا ''تم کیوں کر حیران ہوئے جاتے ہو؟''، لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ شخص کثرت عبادت کے ساتھ مرتبہ شہادت سے بھی

سرفراز ہوا لیکن جنت میں یہ بعد میں داخل ہو رہا ہے اور اس معاملے میں دوسرے کو اس پر ترجیح دی گئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''یہ بتاؤ طبعی موت مر کر پہلے جنت میں داخل ہونے والا شہید کے بعد ایک سال کی مدت زندہ رہا کہ نہیں؟ انھوں نے عرض کیا: جی ہاں کیوں نہیں، بالکل ایسا ہی ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا اس نے رمضان کا مہینا پا کر اس کے روزے نہیں رکھے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے فرمایا: بالکل یارسول اللہ! پھر آپ نے پوچھا: کیا اس نے اس سال میں اتنی اتنی نمازیں نہیں پڑھیں اور سجدے نہیں کیے؟ انھوں نے عرض کیا: کیوں نہیں، یارسول اللہ! ایسا ہی ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بس اسی وجہ سے ان کے درمیان زمین و آسمان کا فرق واقع ہو گیا''۔ (مسند احمد) عرصۂ حیات کا قدرے لمبا ہو جانا، اصل میں مہلت عمل میں اضافہ ہے اور نیک بندے کے لیے یہ مہلت بہت کام کی چیز ہے۔ اسی لیے مومن زندگی سے کبھی نہیں گھبراتا اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ یہی تو اس کی کمائی کی جگہ ہے۔ مشکل ترین حالات میں بھی زندگی سے پیچھا چھڑانے یا موت کی طلب سے یہ فرما کر روکا گیا: ((إِمَّا مُحْسِنًا فَلَعَلَّهُ أَنْ يَزْدَادَ خَيْرًا، وَإِمَّا مُسِيئًا فَلَعَلَّهُ أَنْ يَسْتَعْتِبَ)) (صحیح بخاری) ''یا تو بندہ نیک ہے تو امید ہے اس کی نیکی ہی میں اضافہ ہو گا اور اگر وہ برا ہے تو شاید وہ توبہ کر لے''۔ لمبی عمر کی خواہش ہر انسان میں ہوتی ہے، لیکن باعثِ بشارت عمر وہ ہے جس حسن عمل کے ساتھ ہو: ((طُوبَى لِمَنْ طَالَ عُمْرُهُ وَحَسُنَ عَمَلُهُ)) (سنن ترمذی) ''بشارت ہے اس کے لیے جس کی عمر زیادہ ہو اور اس کا عمل نیک ہو''۔ اب جسے یہ مہلت عمل رمضان کی صورت میں دی جائے تو یقیناً وہ خوش قسمت ہے۔ اس لیے کہ عام طور پر یہ نیکی کا مہینا تو ہے ہی لیکن دوسری طرف برائی کی قوتیں، سرکش شیاطین اور جنات کو قید کر دیا جاتا ہے یعنی رمضان کا مل جانا گویا نیکی کی عمر، یا نیکی کی عمر کے ایک حصے کو پالینا ہے، اسی لیے تو ''بلغنا رمضان'' کی دعائیں مانگی جاتی رہیں۔ تو خوش قسمت ہے وہ جس نے رمضان کا مہینا پایا اور اس میں حسن عمل کا اہتمام کیا اس لیے کہ یہ نجات کا مہینا ہے: ((لِلَّهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذَلِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ)) (سنن ترمذی) ''بے شک اللہ کی طرف سے بہت سارے لوگوں کو دوزخ سے نجات دی جاتی ہے اور یہ معاملہ رمضان کی ہر رات میں ہوتا ہے''۔

رمضان، محنت و مشقت کا مہینا ہے۔ دن کو روزہ رکھ کر اپنے کھانے پینے کی قربانی دینا اور شب کو بیدار رہ کر اللہ کی عبادت کرنا یقینا ایک محنت طلب کام ہے، لیکن اس تکان سے راحت جنت کی صورت میں ملنے والی ہے۔ وہ جنت جسے رمضان میں سجایا جاتا ہے تو اسے یہ پیغام دیا جاتا ہے ((يُوشِكُ عِبَادِي الصَّالِحُونَ أَنْ يُلْقُوا عَنْهُمُ الْمَئُونَةَ وَالْأَذَى وَيَصِيرُوا إِلَيْكِ))(مسند احمد) "قریب ہے کہ میرے نیک بندے، اپنی تکلیف و تھکاوٹ اتارنے تیری طرف آئیں"۔ تو اہل ہوس کی سب مصلحتوں کو پامال کیجیے۔ تن بدن کی راحت، کام و دہن کی لذت اور نیندِ شب کی صحت کی پرواہ مت کریں۔ دن کو روزہ رکھیں تو اس کے آداب کا خیال رہنا چاہیے۔ ممنوعات و مکروہات سے اجتناب کا خوب اہتمام ہونا چاہیے۔ قرآن کریم کی کثرت سے تلاوت، اللہ کے نام کا خوب خوب ذکر، تراویح کی اچھی طرح ادائی، سنت موکدہ، غیر موکدہ، نماز تہجد، صلاۃ التسبیح اور دیگر نوافل کا اہتمام، دروس قرآن کی محافل میں شرکت اور صدقہ و خیرات سمیت نیکی کے امور میں خود کو خوب تھکانا چاہیے کہ ہمارے لیے تھکان سے آسودگی کا مقام بہت عمدہ ہے۔

درسِ قرآن

سورۃ البقرہ:۱۸۵تا۱۸۶

حماد احمد ترک

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾

”رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لیے سراپا ہدایت، اور ایسی روشن نشانیوں کا حامل ہے جو صحیح راستہ دکھاتی اور حق و باطل کے درمیان دوٹوک فیصلہ کردیتی ہیں، لہذا تم میں سے جو شخص بھی یہ مہینا پائے وہ اس میں لازماً روزہ رکھے“۔

”صوم کا لغوی معنی کسی چیز سے رکنا اور اس کو ترک کرنا ہے۔ صوم کو ہماری زبان میں روزہ کہتے ہیں۔ اس کا شرعی معنی ہے: مکلف اور بالغ شخص کا ثواب کی نیت سے طلوعِ فجر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور جماع کو ترک کرنا اور اپنے نفس کو تقوی کے حصول کے لیے تیار کرنا۔ تمام ادیان اور ملل میں روزہ معروف ہے۔ قدیم مصری یونانی رومن اور ہندو سب روزہ رکھتے تھے۔ موجودہ تورات میں بھی روزے داروں کی تعریف کا ذکر ہے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا چالیس دن روزہ رکھنا ثابت ہے۔ اس طرح موجودہ انجیلوں میں بھی روزے کو عبادت قرار دیا گیا ہے اور روزے داروں کی تعریف کی گئی ہے۔ ہجرت کے ڈیڑھ سال اور تحویل قبلہ کے بعد دس شعبان کو روزہ فرض کیا گیا۔ اور اس عبادت کے لیے ماہ رمضان کو پسند کیا گیا۔ اس لیے کہ دن کے روزے کے ساتھ رات کا قیام بھی اللہ تعالی کی حکمت میں شامل تھا، قیام کے لیے ترتیل و سماعِ قرآن ضروری تھا، روزے کی عبادت کے لیے ماہ رمضان کو قرآن مجید کے ساتھ اس کے خاص تعلق کی وجہ سے پسند کیا گیا۔ اسی ماہ مبارک میں یہ عظیم کتاب لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر اتاری گئی۔ اسی مہینے میں نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم پر بواسطہ جبریل علیہ السلام اس کے نزول کی ابتدا ہوئی۔ اسی مہینے میں ہر سال نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم ، جبریل علیہ السلام کے ساتھ مل کر اس کا دور کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اس دور قرآنی میں بعض بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

کوبھی شریک کیا جب کہ اس کی عام ترغیب بھی دی اور فرمایا:((مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (بخاری) ''جس نے رمضان کی راتوں میں ایمان واحتساب کے ساتھ قیام کیا اس کے سابقہ گناہ معاف ہوجائیں گے''۔

((اَلصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، يَقُولُ الصِّيَامُ: أَيْ رَبِّ، مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ، فَشَفِّعْنِي فِيهِ، وَيَقُولُ الْقُرْآنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِي فِيهِ قَالَ: فَيُشَفَّعَانِ))(مسند احمد)''روزہ اور قرآن بندے کی سفارش کریں گے، روزہ کہے گا: اے اللہ! میں نے اسے دن بھر کھانے پینے اور دیگر خواہشات سے روکے رکھا، تو اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما، اور قرآن کہے گا: میں نے اسے رات کو نیند سے روکے رکھا، پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما، پس ان دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی''۔

﴿وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

''اور اگر کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے، اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے اور تمھارے لیے مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا، تاکہ (تم روزوں کی) گنتی پوری کرلو، اور اللہ نے تمھیں جو راہ دکھائی اس پر اللہ کی تکبیر کہو اور تاکہ تم شکر گزار بنو''۔

ان آیات میں اللہ تعالی نے انسانوں کے لیے آسانی فرمائی ہے اور مریض اور مسافر کو یہ رعایت دی ہے کہ وہ روزہ چھوڑ سکتے ہیں البتہ رمضان کے بعد انھیں بطور قضا روزہ رکھنا پڑے گا۔ مسافر کے لیے روزہ رکھنا اور روزہ نہ رکھنا دونوں جائز ہیں اگر اس کو روزہ رکھنے سے ضرر نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے اور اگر ضرر ہو تو روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔

﴿يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾

اسلام دین یسر ہے، اسلام نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا جس سے امت حرج اور دشواری میں مبتلا ہوجائے۔ قرآن مجید میں ہے: '' اللہ تعالیٰ یہ ارادہ نہیں فرماتا کہ تم پر تنگی کی جائے''۔(المائدہ:٦) اور ''اللہ تعالیٰ نے تم پر دین میں کوئی

تنگی نہیں کی"۔(الحج:۸۷) مریض اور مسافر کو دی جانے والی چھوٹ اللہ تعالی کی اسی آسانی پر مبنی ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ

فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾

"اور (اے پیغمبر) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجیے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں لہذا وہ بھی میری بات دل سے قبول کریں، اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ راہ راست پر آجائیں"۔

اس آیت میں اللہ تعالی نے واضح فرمادیا کہ اللہ تعالی اپنے بندوں کے قریب ہے اور بندے جب چاہیں اور جہاں چاہیں اپنے رب سے دعا کے ذریعے رابطہ کرسکتے ہیں۔ البتہ اس کے لیے انسان کو اللہ تعالی کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرنا پڑے گا۔ انسان اللہ تعالی کے احکامات کو ماننے اور اپنے ایمان کو راسخ رکھے تاکہ اللہ سے اس کا تعلق مضبوط ہو۔ رمضان کے احکام کے ذیل میں قبول دعا کا ذکر کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے روزے اور رمضان میں دعاؤں کی قبولیت کے مواقع زیادہ ہیں اس لیے ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

رمضان: نیکیوں میں محنت کا مہینا

ابنِ عباس

((عَنْ عَائِشَةَ رضی الله عنها زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا قَالَتْ:كَانَ رَسُولُ اللهِﷺ إِذَا دَخَلَ رَمَضَانَ شَدَّ مِئْزَرَهُ، ثُمَّ لَمْ يَأْتِ فِرَاشَهُ حَتَّى يَنْسَلِخَ)) (صحيح ابن خزيمه)

''رسول اللہ ﷺ کی زوجہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہتی ہیں کہ جب رمضان کا مہینا آتا تو نبی کریم ﷺ اپنا ازار کس لیتے اور پھر رمضان گزرنے تک بستر پہ نہ آیا کرتے''۔

امیر صنعانی اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ''ازار مضبوط کرنا، عبادت میں محنت اور بیوی کی مقاربت ترک کرنے کے لیے کنایہ ہے۔ اس سے ماہ رمضان میں نبی کریم ﷺ کی ریاضت اور اجتناب شہوات کا پتا چلتا ہے۔ اور مومن کے لیے یہی طرز عمل پسندیدہ ہے البتہ بعض روایات میں یہ طرز عمل آخرے عشرے کے بارے میں بھی نقل ہوا ہے''۔(التنویر شرح جامع الصغیر)

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یہ عنوان لگایا ہے: بَاب اسْتِحْبَاب تَرْكِ الْمَبِيتِ عَلَى الْفِرَاشِ فِي رَمَضَانَ إِذِ الْبَائِتُ عَلَى الْفِرَاشِ أَثْقَلُ نَوْمًا، وَأَقَلُّ نَشَاطًا لِلْقِيَامِ مِنَ النَّائِمِ عَلَى غَيْرِ الْفُرُشِ الْوَطِيئَةِ الْمُمَهَّدَةِ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ ''رمضان میں بستر پر رات بسر کرنے کو ترک کرنے کی پسندیدگی کیونکہ بستر پر رات بسر کرنے والا نیند سے بوجھل ہو جاتا ہے اور ایسے شخص میں قیام کے لیے نشاط بھی، بغیر اچھے بستر کے سوانے والے سے کم ہوتا ہے'' مراد یہ ہے کہ انسان رمضان میں زیادہ تر عبادت میں مصروف رہے اور عام دنوں کے نرم بچھونوں سے اجتناب کرے تاکہ نیند میں اشتغال زیادہ نہ بڑھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بچھونوں سے اجتناب، عبادت میں نشاط کے لیے تجویز کیا جارہا ہے لہذا اس معاملے میں خود پر اتنی سختی کرنا بھی مناسب نہ ہوگا کہ انسان کسی جسمانی بیماری کا شکار ہو کر فرض عبادات سے بھی محروم رہ جائے بلکہ ہر انسان کو اپنے احوال وظروف کا خیال کرتے ہوئے اپنے عام دنوں کے آرام وآسائش کو کم کرنا چاہیے۔

ایک شخص رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس آیا اور اس نے کہا یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجیے میں خود کو خصی (جنسی تعلقات کے لیے ناکارہ) بنالوں، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ((خِصَاءُ أُمَّتِي الصِّيَامُ وَالْقِيَامُ)) (مسند احمد) "میری امت کا خصی پن روزے اور قیام میں ہے"۔ مطلب یہ ہے روزہ اور شب بیداری کی مشقت، بغیر کسی جسمانی تبدیلی کے تمھیں جنسی عمل کی طرف سے بے رغبت کیے رکھے گی۔ ویسے تو یہ دونوں عمل عام زندگی کے لیے بیان کیے گئے ہیں لیکن رمضان میں قدرتی طور پر یہ دونوں چیزیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں کہ انسان دن کا روزہ رکھے اور شب کو قیام کرے، ان دو کاموں سے انسان اپنی شہوت کو توڑے گا۔ انھی دو کی طرف اشارہ کیا گیا اس فرمان پاک میں: ((الصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، يَقُولُ الصِّيَامُ أَيْ رَبِّ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِي فِيهِ، وَيَقُولُ الْقُرْآنُ: مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِي فِيهِ قَالَ فَيُشَفَّعَانِ)) (مسند احمد) "روزہ اور قران قیامت والے دن بندے کے حق میں سفارش کریں گے، روزہ کہے گا: اے میرے رب: میں نے اس بندے کو دن میں کھانے پینے اور دیگر خواہشات سے روکے رکھا، پس تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما، اور قرآن کہے گا: اے میرے رب! میں نے بندے کو رات میں نیند سے روکے رکھا، تو اس کے لیے میری سفارش قبول فرما، پس ان دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی"۔

مقالات

الدنيا يوم ولنا فيه صوم

حافظ عمیر انور

الدنیا یوم ولنا فیه صوم ''دنیا؛ دن ہے اور ہم اس میں روزے دار''

تفسیرِ نیشاپوری اور تفسیرِ حقی دونوں میں سورۂ مریم کی آیت نمبر ۲۶ کی تفسیر کے ضمن میں علماء کی جانب نسبت کرتے ہوئے جبکہ تفسیرِ مظہری اور معارف القرآن از مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ میں سورۃ الحشر کی آیت نمبر ۱۸ کی تفسیر کے ذیل میں حدیثِ نبوی ﷺ کی حیثیت سے وہ قول نقل کیا گیا ہے جسے اس تحریر کے عنوان کی حیثیت سے درج کیا گیا ہے۔ اس قول کا مطلب ہے: '' دنیا (کی زندگی) ایک دن ہے اور اس دن میں ہمارا روزہ ہے''۔ اس جملے میں دو باتیں انتہائی قابلِ غور ہیں:

۱۔ پورے دنیاوی عرصۂ حیات کو بس ایک دن کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ اس دورانیہ میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے بندوں کی کیفیت روزے دار کی سی ہوتی ہے۔

اگر ان دو باتوں پر قرآن و سنت کی روشنی میں غور کیا جائے تو ہماری عبرت و نصیحت کے لیے سامانِ وافر دستیاب ہو جائے گا۔ ان شاءاللہ

صرف ایک دن کی زندگی

انسانی زندگی کی طوالت پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسانی زندگی ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ اس کی وسعتوں کا کوئی اندازہ نہیں۔ یہ انسانی روحوں کی پیدائش سے کسی نہ کسی شکل میں جاری وساری اور آخرت میں حساب کتاب اور نتائج کے اعلان کے بعد ابدالآباد تک جاری رہے گی۔ بقولِ شاعر:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

لیکن اسی حیاتِ انسانی کے ایک خاص اور نتائج کے اعتبار سے اہم ترین حصے یعنی حیاتِ دنیوی پر غور کیا جائے کہ جس

پر کہ اس کی حیاتِ برزخی اور حیاتِ اخروی کا دارومدار ہو گا تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ عرصہ عجیب و غریب کیفیات کا حامل ہے۔ انسانوں کی اکثریت اس کی اصل حقیقت اور کیفیت نہیں پہچان پاتی۔ اس کے بارے میں مختلف مغالطوں اور دھوکوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ایسی موہوم راہوں میں الجھ کر اپنی منزل کھوٹی کر بیٹھتی ہے اور ہمیشہ ہمیش کی ناکامی و خسران کا باعث ہو جایا کرتی ہیں۔ انھی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے لیے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے کلام میں کئی ایک مقامات پر کئی ایک طریقے اور انداز اختیار فرما کر انسانوں کو اصل حقیقت سے روشناس کراتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ الحشر میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾(الحشر:۱۸)ترجمہ:" اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر ایک کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ یقیناً اس سے پوری طرح باخبر ہے"۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:"اس آیت میں قیامت کو لفظ غد سے تعبیر کیا جس کے معنی ہیں آنے والی کل، اس میں تین چیزوں کی طرف اشارہ ہے، اول پوری دنیا کا بمقابلہ آخرت نہایت قلیل و مختصر ہونا ہے کہ ساری دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایک دن کی مثال ہے۔۔۔ دوسرا اشارہ اس میں قیامت کے یقینی ہونے کی طرف ہے، جیسے آج کے بعد کل کا آنا امر یقینی ہے، کسی کو اس میں شبہہ نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا کے بعد قیامت و آخرت کا آنا یقینی ہے۔ تیسرا اشارہ اس طرف ہے کہ قیامت بہت قریب ہے۔ جیسے آج کے بعد کل کچھ دور نہیں، بہت قریب سمجھی جاتی ہے، اسی طرح دنیا کے بعد قیامت بھی قریب ہے۔ اور قیامت ایک تو پورے عالم کی ہے جب زمین و آسمان سب فنا ہو جائیں گے، وہ بھی اگرچہ ہزاروں لاکھوں سال کے بعد ہو مگر بمقابلہ مدت آخرت کے بالکل قریب ہی ہے، دوسری قیامت ہر انسان کی اپنی ہے جو اس کی موت کے وقت آجاتی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے من مات فقد قامت قیامته، یعنی جو شخص مر گیا اس کی قیامت تو ابھی قائم ہو گئی کیونکہ قبر ہی سے عالم آخرت کے آثار شروع ہو جاتے ہیں اور عذاب و ثواب کے نمونے سامنے آجاتے ہیں"۔ اس تشریح میں بہت اہم امور کی وضاحت ہو گئی۔ سب سے پہلی بات یہ کہ دنیوی زندگی جسے بالعموم انسان بہت طویل سمجھتا ہے، دراصل انتہائی قلیل ہے۔ اگر اس سوال پر غور کیا جائے کہ انسان کی دنیوی زندگی کتنی طوالت کی حامل ہے تو بالعموم ذہنوں جو بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس بات سے لاعلم ہیں کہ کسی انسان کی دنیوی زندگی کتنی مدت کو محیط ہے۔ لیکن قرآنِ حکیم میں بیان شدہ

حقائق کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سوال کے جواب میں ہمارا طرزِ فکر کیا ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی دنیوی زندگی صرف ایک دن یا اس دن کے کسی ایک حصے جتنی طویل ہوا کرتی ہے اور یہ دن بھی وہی دن ہوا کرتا ہے جو کہ فی الوقت اس کی زندگی میں موجود ہے۔ گویا ہر روز ہماری زندگی اُس ایک دن پر مشتمل ہوا کرتی ہے جو کہ ہم گزار رہے ہوتے ہیں۔ اس کی دو بڑی بڑی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ ہماری زندگیوں کا جو حصہ گزر چکا ہے وہ کبھی لوٹ کر واپس نہیں آسکتا۔ پھر اس گزرے ہوئے وقت کے بارے میں ایک نمایاں حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا وقت اور گزری ہوئی زندگی ہر انسان کو صرف ' ایک دن یا دن کے ایک حصے کی مانند' معلوم ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کا اظہار ان آیات میں ہوا ہے جو سورۃ المومنون کے آخری رکوع میں وارد ہوئی ہیں: ﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْأَلِ الْعَادِّيْنَ ﴿ قَالَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيْلاً لَّوْ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (المومنون:۱۱۲تا۱۱۴) ترجمہ: "پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا: بتاؤ تم کتنے سال زمین میں رہے؟ وہ کہیں گے: یہی کوئی ایک دن یا اس کا کچھ حصہ، اور یہ بات تو شمار کرنے والوں سے پوچھیے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: واقعی تم تھوڑا ہی عرصہ وہاں ٹھہرے تھے۔ کاش تم یہ بات (اس وقت بھی) جانتے ہوتے"۔ اہلِ جہنم کے اس جواب سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس دنیوی زندگی کو وہ بہت ہی پائیدار اور طویل سمجھ رہے تھے اور جس کے ناجائز مفادات اور فانی لذات و سامانِ تعیش کی خاطر وہ ایمان و اعمالِ صالحہ کی دولت کو سمیٹنے اور اس دن کی تیاری کر لینے سے غافل رہے، یہی زندگی اب انھیں محض ایک دن یا اس کے کچھ حصے جتنی مختصر محسوس ہو رہی ہوگی۔ اسی طرح آخرت کو نہ ماننے والے کفار کے بارے میں فرمایا: ﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا﴾ (النازعات:۴۶) ترجمہ: "جب وہ اسے دیکھیں گے تو انھیں ایسا معلوم ہوگا کہ گویا وہ (دنیا میں) بس ایک پچھلا یا پہلا پہر ٹھہرے تھے"۔ جبکہ ایک اور مقام پر اسی کیفیت کا ذکر یوں فرمایا: ﴿وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنَ النَّهَارِ﴾ (یونس:۴۵) ترجمہ: " اور جس دن اللہ انھیں جمع کرے گا (تو وہ یوں محسوس کریں گے) جیسے (دنیا میں) دن کی صرف ایک ساعت ہی رہے ہوں"۔ گزرے ہوئے وقت کی اس صفتِ اختصار اور موجودہ وقت کے بہاؤ کی سرعت کو ہر انسان انصاف سے غور کرنے پر بآسانی محسوس کر سکتا ہے۔ دوسری وجہ کہ جس کی بدولت دنیوی زندگی کی

طوالت محض ایک دن یا اس کے ایک حصے جتنی سمجھی جانی چاہیے وہ یہ کہ انسان کا مستقبل اس لحاظ سے انتہائی غیر یقینی ہوا کرتا ہے کہ اس کے پاس اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ مستقبل میں آنے والا وقت یا دن اسے اپنی زندگی میں دیکھنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ ممکن ہے کہ آنے والا دن اس کی زندگی میں موت کا پیغام لے کر آرہا ہو اور اسے اس کی کوئی خبر ہی نہ ہو۔ اس بات کو آخر کس بنیاد پر یقینی سمجھا سکتا ہے کہ اسے اپنی زندگی میں ایک اور دن عافیت کے ساتھ گزارنا نصیب ہو سکے گا۔ اس لیے حقیقت یہی ہے کہ انسان کی زندگی ہر روز صرف اسی ایک دن پر مشتمل ہوا کرتی ہے جو کہ اس کی زندگی میں موجود ہے۔ اس بات کا تیقن حاصل کر لینے کے بعد انسان کو اپنی دنیوی زندگی کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے، اس کی وضاحت اس فرمان رسول اللہ ﷺ میں ہوتی ہے جو آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے کندھے پکڑ کر فرمایا تھا: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ وَعُدَّ نَفْسَكَ فِي أَهْلِ الْقُبُورِ ترجمہ: "دنیا میں کسی مسافر یا کسی راہ گیر کی طرح رہو اور خود کو قبر والوں میں شمار کرو"۔ حضرت مجاہد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ پھر ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے مجھ سے فرمایا: إِذَا أَصْبَحْتَ فَلاَ تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ وَإِذَا أَمْسَيْتَ فَلاَ تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ قَبْلَ سَقَمِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ قَبْلَ مَوْتِكَ فَإِنَّكَ لاَ تَدْرِي يَا عَبْدَ اللهِ مَا اسْمُكَ غَدًا)) (سنن ترمذی) (اگر صبح ہو جائے تو شام کا بھروسا نہ کرو اور اگر شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کرو بیماری آنے سے پہلے صحت سے اور موت آنے سے پہلے زندگی سے فائدہ حاصل کرو کیونکہ تمھیں نہیں معلوم کہ کل تمھارا نام کیا ہوگا"۔ یعنی کیا تمھیں عبداللہ کے نام سے پکارا جائے گا یا میت کے نام سے۔ تو حضرت رسول اللہ ﷺ کے الفاظِ مبارکہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا کو اپنا اصلی وطن اور اصل ٹھکانہ سمجھنا خام خیالی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے اختصار اور ناپائیدار ہونے کی کیفیت کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں یوں بیان فرمایا: ((وَاللهِ مَا الدُّنْيَا فِي الآخِرَةِ إِلاَّ مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ هَذِهِ - وَأَشَارَ يَحْيَى بِالسَّبَّابَةِ - فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَ يَرْجِعُ)) (صحیح مسلم) ترجمہ: "خدا کی قسم دنیا کو آخرت کے ساتھ صرف اتنی ہی نسبت ہے جتنی تم میں سے کسی شخص کی انگلی سمندر میں ڈوبنے پر قطرے کو سمندر سے ہوتی ہے، کہ جب وہ یہ انگلی ڈبوتا ہے تو باہر نکال کر دیکھے کہ اس پر کتنا پانی لگا ہے"۔ یہی موازنہ دنیا اور آخرت کی زندگی کے بارے میں انسان کے پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ دنیا کے عارضی ہونے کا یقین کر لینے کے بعد اس کیفیت کو یوں اپنے اوپر طاری کر لینا چاہیے کہ

انسان اپنے آپ کو ان میں سے شمار کرنا شروع کرے جو کہ اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ جس طرح ان کا اپنے مال سے، اپنی جائیداد سے، اپنے گھر اور گھر والوں سے، اپنے رشتے داروں اور دوسرے متعلقات سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے اسی طرح اس کا بھی ان تمام سے یہ رشتہ ٹوٹا ہی چاہتا ہے۔ جس طرح وہ یہ سب کچھ اسی فانی دنیا میں چھوڑ کر کسی اور عالَم کی طرف سدھار چکے ہیں اسی طرح اس کی روانگی کا وقت بھی آیا ہی چاہتا ہے۔ اسی کے نتیجہ میں اس بات کا امکان ہے کہ انسان کا دل دنیا کی محبت سے فارغ ہو جائے۔ اس کے بعد وہ یکسوئی کے ساتھ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی محبت و فرمانبرداری اور آخرت کی تیاری کی طرف متوجہ ہو سکے گا۔ لیکن انسانوں کی اکثریت کا المیہ یہ ہے کہ وہ اس اظہر من الشمس حقیقت کا ادراک نہیں کر پاتے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ ہر گزرنے والا دن انھیں ان کی موت سے قریب تر کرتا چلا جا رہا ہے۔ پھر آج کے بعد کل کا دن دیکھنے کا موقع ملنا بھی انتہائی غیر یقینی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اکثر و بیشتر انسان اس دنیا کے ساتھ ہی چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں انسان کی عجیب و غریب نفسیات کو بڑی خوبصورتی سے واضح فرمایا ہے: ((يَكْبَرُ ابْنُ آدَمَ وَيَكْبَرُ مَعَهُ اثْنَانِ حُبُّ الْمَالِ ، وَطُولُ الْعُمُرِ))(صحیح بخاری) ترجمہ: ”آدمی کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور اس کی دو اور چیزیں بھی بڑی ہوتی جاتی ہیں مال کی محبت اور درازی عمر کی خواہش“۔ اگر چہ انسان اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہر گزرتا ہوا لمحہ اس کی زندگی میں ہر گز کوئی اضافہ نہیں کر رہا بلکہ اس کو مہلتِ عمل کو برف کی طرح مسلسل پگھلا کر اختتام ہی کی جانب لے کر جا رہا ہے۔ بقولِ شاعر:

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی　　　گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

اس کے باوجود ناقابلِ یقین واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنی عمر کی طوالت کی خواہش کے سحر میں نہ صرف گرفتار رہتا ہے بلکہ اپنے اس مفروضے کو ایک اٹل حقیقت مانتے ہوئے اپنے آپ کو پوری طرح مطمئن کر کے زندگی گزارتا چلا جاتا ہے۔ اس پر مزید حیرت انگیز امر یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں طویل زندگی کی خواہش مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ موت انتہائی ناگوار شے محسوس ہوا کرتی ہے اور اس کا تذکرہ تک سننا انسان کا گوارہ نہیں ہوتا۔ قومِ یہود بحیثیتِ مجموعی اسی کیفیت کا بدترین انداز میں شکار ہوئی، اسی لیے قرآن ان کی نفسیات یوں بیان فرماتا ہے:﴿يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ﴾(البقرہ:۹۶) ترجمہ: ”ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ

کسی طرح ہزار برس جیے"۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان اپنی حیاتِ دنیوی کی طوالت کا کتنا ہی حریص ہو جائے، اپنے مستقبل کے لیے کیسے ہی لمبے چوڑے منصوبے تخلیق کر لے، کتنے ہی ہزار برس کا سامان جمع کر لے غرض یہ کہ کیسا ہی ایڑی چوٹی کا زور لگا لے، موت اپنے طے شدہ وقت پر آکر اس کی مہلتِ عمل کا خاتمہ کر کے رہتی ہے۔ اس سے بھاگنا بے سود اور لاحاصل ہے۔ دنیا کا کوئی مقام یا بچاؤ کی جگہ موت سے حفاظت کے لیے سپر کا کام نہیں دے سکتی۔ چنانچہ سورۃ الجمعہ میں یہود کو مخاطب کر کے یہی حقیقت بیان کر دی گئی: ﴿قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ﴾ (الجمعہ:۸) ترجمہ: "آپ ان سے کہیے: جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تو تمھیں آ کے رہے گی"۔ ایک اور مقام پر اسی حقیقت کا بیان یوں فرمایا: ﴿قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ﴾ (الاحزاب:١٦) ترجمہ: "اے نبی ﷺ! ان سے کہو، اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمھارے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا"۔ جبکہ سورۃ النساء میں بالکل دوٹوک انداز میں واضح فرما دیا کہ: ﴿أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ﴾ (النساء:۷۸) ترجمہ: "رہی موت، تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمھیں آ کر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو"۔ گویا موت کا ٹھیک وقت پر وارد ہو جانا بالکل برحق ہے، لازم ہے، اٹل ہے اور شدنی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود انسان کی غفلت کا عالم یہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر اس زندگی کی طوالت ہی کی خواہش کرتا رہتا ہے اور اسی فانی دنیا کو اپنا اصل وطن سمجھتے ہوئے ہمیشہ یہیں کا باسی بنا رہنا چاہتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا کلام یہ بات بالکل دوٹوک انداز میں واضح فرماتا ہے کہ اس کا موت سے یہ فرار اسے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا: ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ﴾ (ق:١٩) ترجمہ: "اور یہ حقیقت کھولنے کے لیے موت کی بے ہوشی آ پہنچی، یہی وہ بات ہے جس سے تو (اے انسان) گریز کرتا رہا"۔ حقیقت تو یہی ہے یہاں کوئی انسان بھی ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا: ﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِنْ مِتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ * كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ--﴾ (الانبیاء:۳۴،۳۵) ترجمہ: "(اے نبی!) آپ سے پہلے بھی ہم نے کسی انسان کے لیے دائمی زندگی تو نہیں رکھی، اگر آپ مر جائیں تو کیا یہ ہمیشہ زندہ رہیں گے؟ ہر جاندار کو موت کا مزا چکھنا ہے"۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن ہمارے قلوب میں جاگزیں کرنا چاہتا ہے اور اسی

کے نتیجے میں بندہ اپنا محاسبہ کرتے ہوئے اپنی توجہات آخرت کی تیاری اور کامیابی پر مرکوز کر دیتا ہے۔ اسی طرزِ عمل کو حضرت رسول اللہ ﷺ نے اصل عقلمندی قرار دیا ہے: ((الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنَّى عَلَى اللهِ)) (سنن ترمذی) ترجمہ: ”عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کو پہچانے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے جبکہ بے وقوف وہ ہے جو اپنے نفس کی پیروی کرے اور اللہ تعالی سے امید رکھے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں مَنْ دَانَ نَفْسَهُ کا مطلب حسابِ قیامت سے پہلے، اس دنیا میں نفس کا محاسبہ کرنا ہے۔ اس کے بعد امام ترمذی نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے آپ فرمایا کرتے: حَاسِبُوا أَنْفُسَكُمْ قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوا وَتَزَيَّنُوا لِلْعَرْضِ الأَكْبَرِ وَإِنَّمَا يَخِفُّ الْحِسَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهُ فِي الدُّنْيَا اپنے نفسوں کا محاسبہ کرو اس سے قبل کہ تمھارا محاسبہ کیا جائے اور بڑی پیشی کے لیے تیار ہو جاؤ بے شک قیامت کے دن اس آدمی کا حساب آسان ہو گا جس نے دنیا ہی میں اپنا حساب کر لیا“۔ یہ تیاری اور محاسبہ ہم سب کو بغیر کوئی وقت ضائع کیے فوراً شروع کر دینا چاہیے۔ اپنی زندگی کا ہر دن اسی محاسبے اور تیاری کی کوششوں میں یہ سمجھتے ہوئے بسر کرنا چاہیے کہ یہ دن ہماری زندگی کا آخری دن ہے۔ اس کے بعد نہ جانے ایسا موقع مل بھی سکے گا یا نہیں۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہما نے اسی بات کی نصیحت اوپر گزری حدیثِ مبارکہ کے راوی حضرت مجاہد علیہ الرحمہ کو فرمائی تھی کہ اگر زندگی کے کسی دن صبح کا وقت دیکھنا نصیب ہو جائے تو نیک اعمال، سچی توبہ اور آخرت کی تیاری کی کوششوں کو شام تک مؤخر نہ کرو۔ اسی طرح شام کا وقت نصیب ہو جائے تو ان امور کو اگلی صبح کے لیے باقی نہ رکھ چھوڑو۔ نہ جانے زندگی میں اس صبح کے بعد کی شام یا شام کے بعد کی صبح میسر بھی آ سکے گی یا نہیں۔ ایک سچے مومن اور غافل انسان کی زندگیوں میں بنیادی طور پر اسی مثبت احساسِ عجلت (Urgency) کی وجہ سے فکر و عمل کا فرق نمایاں طور پر نظر آ رہا ہوتا ہے۔ مومن اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کی قدر و قیمت اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ اس کا ایک لمحہ بھی کسی بے فائدہ کام میں صرف نہیں کرتا۔ وہ اس حقیقت سے بھی خوب اچھی طرح واقف ہوا کرتا ہے کہ اس کا اصل سرمایہ اور اس کی اصل دولت مسلسل گھل کر ختم ہو رہی ہے اور اگر اس نے اس وقت کو آخرت کی تیاری میں لگا کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی تو اسے ایک بہت بڑے خسارے اور گھاٹے کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ وہ اس متاعِ وقت

کے ایک ایک لمحے کو دنوں، اس کے ایک ایک منٹ کو مہینوں اور اس کے ایک ایک گھنٹے کو سالوں کے برابر گردانتے ہوئے اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے۔ پھر ایسے ہی لوگوں کی پُرخلوص محنتوں اور کاوشوں کی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ بھی بھرپور پذیرائی فرمائے گا اور محض اپنے فضل وکرم اور عنایت سے انھیں معاف فرما کر اپنی رضا کے مقام جنت میں داخل فرما دے گا۔ اس جنت میں داخلے کے بعد ان خوش نصیبوں کو اپنے گزرے ہوئے وقت میں سے صرف ان گھڑیوں پر افسوس ہوگا جو اللہ کے ذکر کے بغیر گزری ہوں گی (شعب الایمان)۔ اس کے برعکس ایک غافل اور آخرت پر یقین نہ رکھنے والے انسان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا وقت مسلسل غیر مفید کاموں یا دنیا کو زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کو کوششوں میں کھپا دیتا ہے۔ آخرت کی تیاری سے غفلت برتتا ہے۔ جب کبھی آخرت کی یاددہانی یا کسی اچھی نصیحت یا دل پذیر وعظ کے نتیجے میں اس کا دل نرم پڑتا ہے اور اس کے باطن میں اپنی اصلاح کا داعیہ پیدا ہوتا ہے تو بدقسمتی سے ان اصلاحِ احوال کی کاوشوں کو زندگی کی طوالت کی امید پر مؤخر کرتے ہوئے مستقبل پر ٹالتا چلا جاتا ہے۔ کبھی اپنے موجودہ وقت اور اپنے آج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی فوری اصلاح اور سچی توبہ کی طرف پیش قدمی نہیں کرتا بلکہ اس کا نفس اس کو مستقبل کے حسین نقشے دکھا کر تھپکی دیتا ہے اور شیطان اسی غفلت کی نیند میں سلائے رکھنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے۔ اسی تاخیر اور ٹال مٹول کی روش میں ایک ایک کرکے دن پر دن، ہفتوں پر ہفتے، مہینوں پر مہینے اور سالوں پر سال گزرتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کی زندگی کا آخری دن آجاتا ہے۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے بعد اس کی زندگی میں اپنی اصلاح کے لیے مزید کوئی دن اور وقت ہی نہیں بچا ہے۔ وہ اسی طرح اپنی زندگی کی طوالت کی امید کے نشے میں مسحور ہو کر یہ دن بھی گزار رہا ہوتا ہے کہ اچانک موت اس کے سر پہ آکھڑی ہوتی ہے۔ ایسے ہی غافل انسان پھر موت کے وقت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے درخواستیں کرتے ہیں: ﴿رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (المنافقون: ۱۰) ترجمہ: ”اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی مدت اور کیوں مہلت نہ دی کہ میں صدقہ کرلیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہوجاتا“۔ اسی طرح ایک اور مقام یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿حَتَّى إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۞ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا﴾ (المومنون: ۹۹،۱۰۰) ترجمہ: ”(یہ لوگ اپنی کارستانیوں میں لگے رہیں گے) جہاں تک کہ ان میں سے کسی کو

جب موت آئے گی تو کہے گا: پروردگار! مجھے دنیا میں واپس بھیج دے۔ جسے میں چھوڑ آیا ہوں امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا"۔(لیکن اللہ کی جانب سے انھیں یہی جواب دیا جاتا ہے کہ) ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ بس ایک (محال) بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ یہ اصول بیان فرمایا ہے ﴿وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا﴾ (المنافقون:١١) ترجمہ:" اور جب کسی کی موت کا وقت آجائے تو پھر اللہ اس کو ہرگز مہلت نہیں دیتا"۔ یہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا اٹل قانون ہے کہ انسان کی موت کا وقت آچکنے کے بعد اسے کوئی مہلت نہیں دی جاتی۔ ایسے موقعے پر وہ سارا مال، وسائل، جمع پونجی، خوبصورت گھر اور مکانات، رشتے دار، اہل و عیال غرض کوئی شے سوائے انسان کے عمل کے اس کے ساتھ نہیں جاتی۔ یہ سب یہیں رہ جاتا ہے اور اسے ایک تاریک گھر میں خواہی نخواہی بالکل تنہا سکونت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اسی لیے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما تلقین فرمارہے ہیں کہ موت سے پہلے زندگی سے اچھی طرح فائدہ اٹھالینا مبادا کل کو تم کفِ افسوس ملتے رہ جاؤ اور اس پچھتاوے کا اس وقت کوئی فائدہ نہ ہو: ﴿يَالَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي﴾ (الفجر:٢٤) ترجمہ: "کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا!"۔ حضرت رسول اللہ ﷺ کا بھی ارشادِ گرامی ہے: ((اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ : شَبَابَکَ قَبْلَ هَرَمِکَ وَصِحَّتَکَ قَبْلَ سُقْمِکَ وَغَنَائَکَ قَبْلَ فَقْرِکَ وَفَرَاغَکَ قَبْلَ شُغْلِکَ وَحَيَاتَکَ قَبْلَ مَوْتِکَ)) (سنن ترمذی) ترجمہ: "تم پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو! اپنی جوانی کو ضعیفی سے پہلے غنیمت جانو، اپنی صحت کو بیماری سے پہلے اور مالداری کو تنگدستی سے پہلے اور فرصت کو مشغولیت سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے"۔

پوری زندگی کا روزہ

زیرِ بحث قول "دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزے سے ہیں" سے مترشح ہوتا ہے کہ ہماری پوری زندگی روزے پر مشتمل ہے۔ اب ہم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حیاتِ دنیوی کو حالتِ روزہ قرار دینے کا کیا مطلب ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ کی مشہور تحریر "دو روزے" سے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں: "روزے دو طرح کے ہیں، ایک چھوٹا روزہ ایک بڑا روزہ۔ چھوٹے روزے کی تحقیر مقصود نہیں، صرف زمانی اور وقتی لحاظ سے کہہ رہا ہوں۔ چھوٹا روزہ کتنا ہی بڑا ہو، ۱۳ گھنٹہ، ۱۴ گھنٹہ کا روزہ ہوگا، بعض ملکوں میں جہاں دن اس زمانہ میں بڑا ہوتا ہے اس سے کچھ زیادہ۔ یہ وہ روزہ ہے جو بلوغ پر

مسلمان پر فرض ہوجاتا ہے، وہ صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور غروبِ آفتاب تک قائم رہتا ہے۔۔۔ بڑا روزہ ہے: اسلام کا روزہ! اسلام خود ایک روزہ ہے اور یہ سب روزے اور عیدین بھی، بلکہ روزہ، نماز یہاں تک کہ جنت بھی، جو اللہ تعالی عطا فرمائے گا، وہ سب اس کے طفیل ہی ہے۔ اصل بڑا روزہ، اسلام کا روزہ ہے۔ وہ کب ختم ہوتا ہے، کب شروع ہوتا ہے، یہ بھی سن لیجیے۔ جو خوش قسمت انسان مسلمان گھر میں پیدا ہوا، اور وہ شروع سے کلمہ گو ہے، اس پر بلوغ کے بعد ہی یہ طویل مسلسل روزہ فرض ہوجاتا ہے اور جو اسلام لائے، کلمہ پڑھے، یہ روزہ اس پر اسلام قبول کرنے کے وقت شروع ہوتا ہے۔ اور یہ روزہ کب ختم ہوگا، یہ بھی سن لیجیے۔ رمضان کا روزہ اور نفلی روزہ تو غروب آفتاب پر ختم ہوجاتا ہے، مگر اسلام کا روزہ تو آفتاب عمر کے غروب ہونے پر ختم ہوگا۔۔۔ اس چھوٹے روزہ کا حکم اور اس کی پابندیاں سب کو معلوم ہیں۔ سب روزہ دار کھانے پینے سے اور ان تمام چیزوں سے بچتے ہیں جو ممنوع ہیں، لیکن اس بڑے روزہ کا خیال بہت کم لوگوں کو ہے حالانکہ یہ روزہ ہم لوگوں کو اس بڑے روزہ کے طفیل ہی ملا ہے، اس بڑے روزہ کی برکت سے ملا ہے، یوں سمجھیے کہ اس بڑے روزہ کے انعام میں ملا ہے، اور عید بھی اسی روزے کے طفیل میں ملی ہے"۔ چھوٹے روزے یعنی رمضان المبارک کے روزے اور بڑے روزے یعنی زندگی بھر کے روزے کی حقیقت سمجھانے کے بعد اس بات کی وضاحت فرماتے ہیں کہ رمضان المبارک میں روزے اور دیگر عبادات کی انجام دہی کے نتیجے میں ہماری زندگیوں پر کیا اثرات مرتب ہونے چاہییں اور یہ کہ زندگی کس انداز میں گزرنی چاہیے۔ چنانچہ مولانا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: "رمضان ختم ہونے کے بعد آپ یہ نہ سمجھیں کہ چھٹی ہوگئی اب ہم آزاد ہیں جو چاہیں کریں۔ ہرگز ایسا نہیں، آپ بالکل آزاد نہیں ہیں۔ آپ کے گلے میں اسلام کا طوق پڑا ہوا ہے۔ آپ کی تختی، آپ کے شناختی کارڈ پر لکھا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ اللہ تعالی کے یہاں اس روز کا حساب ہوگا اور اس روزہ کا بھی حساب و کتاب ہوگا۔ ہم نے آپ کے سامنے آیت پڑھی: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (المائدہ: ۳) "آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور تمھارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا"۔ چاہے کوئی تبدیلی لانا چاہے، سلطنت کہے، بادشاہ کہے، کہ ایسا کرو اور ویسا کرو، بڑے سے بڑا مسلمان اور علم کا دعویٰ کرنے والا کہے، کچھ ہونے کو نہیں۔ جو چیز حرام ہے، قیامت تک حرام رہے گی۔ دنیا میں کسی کو یہ اجازت نہیں اور نہ اس کی مجال ہے کہ اس میں ترمیم کرے۔ شریعت میں اب کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی۔ وہ چیزیں جو حرام ہیں، حرام ہی رہیں گی"۔ اسی طرح آگے چل کر اس بات کی وضاحت فرماتے ہیں ہمارا تیقن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے بارے میں کس کیفیت کا حامل ہونا چاہیے اور کس طرح اسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا چاہیے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: " ہر شخص کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اسلام کا

روزہ ہے، ساری عمر کا روزہ ہے کبھی نہیں ٹوٹ سکتا، جو چیزیں حرام ہیں، حرام ہیں، جو غلط ہیں، وہ غلط ہیں، عقیدہ خالص ہونا چاہیے، سمجھ لیجیے، نہ کوئی قسمت بری بھلی بنا سکتا ہے، نہ کوئی آئی ہوئی بلا کو ٹال سکتا ہے، نہ اولاد دے سکتا ہے، نہ نوکری دلا سکتا ہے، کہ آپ کسی اور سے مانگیں، جو کچھ مانگنا ہو، اسی سے مانگیں جو سمیع و مجیب ہے، وہ فرماتا ہے:﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ--﴾(البقرہ:۱۸۶)(اے نبی) بندے تجھ سے میرے بارے میں پوچھے تو کہہ دیجیے کہ میں قریب ہی ہوں۔ دعا کرنے والے کی قبول کرتا ہوں اور جب بھی وہ دعا کرے"۔ اسی طرح آخر میں زندگی بھر کے روزے کا خیال رکھنے کی نصیحت یوں فرماتے ہیں: "آپ یہاں سے بڑے روزے کا خیال لے کر جائیے خوش ہوئیے، اللہ کا شکر ادا کیجیے، یہ روزہ تو ختم ہو رہا ہے۔ اللہ تبارک و تعالی اور رمضان نصیب کرے۔ مگر زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، صحت کا اعتبار نہیں، ہاں وہ مسلسل و طویل روزہ رہے گا، وہ روزہ مبارک ہو، اس روزہ کا خیال رکھیے، وہ روزہ نہ توڑیئے گا، وہ روزہ اگر ٹوٹا تو سب کچھ ٹوٹ جائے گا، سب کچھ بگڑ گیا۔ بس یہی دو روزے ہیں، ایک روزہ ہے قریب المیعاد، وہ ہے رمضان کا روزہ اور دن بھر کا روزہ ہے۔ ایک روزہ وہ ہے جو زندگی کے ساتھ رہے گا، اور مسلمانوں کے لیے جب سے وہ بالغ ہوا، اس دن تک جب تک سانس اور جان میں جان ہے، اور وہ شخص جس نے اسلام قبول کیا اس کا بھی جب تک بدن میں اس کے جان اور روح ہے، اس وقت تک باقی ہے۔ اللہ تعالی ہمیں اور آپ کو توفیق دے کہ ہم اس روزے کو برقرار رکھیں، اس روزے کی حفاظت کریں اور قدر کریں، اور اس روزے پر جییں اور مریں"۔

ان چیدہ چیدہ اقتباسات سے اس بڑے اور طویل روزے کی تشریح ہو گئی کہ جس کی پابندیوں اور آداب کا ہمیشہ خیال رکھتے ہوئے ہم سب کو اپنی زندگیاں گزارنی چاہییں۔ اسی کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے مولانا محمد ادریس کاندھلوی اپنی تفسیر معارف القرآن میں سور البقرہ کی آیت نمبر ۱۸۸ کی تفسیر میں رقم طراز ہیں: "گزشتہ آیات میں روزہ اور دعا کا ذکر تھا۔ اس آیت میں حرام مال کے کھانے کی ممانعت ہے۔ اشارہ اِس طرف ہے کہ روزہ اور دعا کی قبولیت کے لیے اکلِ حلال شرط ہے۔ نیز پہلے افطار اور سحری کا ذکر تھا۔ اِس آیت میں اِس طرف اشارہ فرمایا کہ افطار اور سحری حلال روزی سے ہونا چاہیے نیز اصلی مقصود روزہ سے طہارت نفس ہے تو جب طہارتِ نفس کے لیے روزہ میں حلال مال کے استعمال کی اجازت نہ رہی تو حرام مال کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟ حلال مال سے روزہ تو صرف تیس دن کا ہے اور حرام مال سے روزہ مدت العمر کے لیے ہے یعنی یہ ساری عمر کا صومِ وصال ہے"۔

حرفِ آخر

محترم قارئین! ہماری زندگیاں ماہِ رمضان المبارک سے ہمکنار ہو رہی ہے۔ اس عظیم قول سے، جس کی وضاحت کی کوشش اس تحریر میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ بات ہمارے سامنے مبرہن ہو جانی چاہیے کہ ہم اس ماہِ مبارک کو اپنے لیے آخری اور سنہری موقع سمجھتے ہوئے گزاریں۔ اس کے ایک ایک لمحے کی قدر کریں اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ سے اپنے قصور معاف کروالینے کی بھرپور کوشش کریں۔ دن کے روزے کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں جبکہ رات کو زیادہ زیادہ وقت قیام و تلاوت اور دعا و مناجات میں صَرف کریں۔ اپنی زندگی کی طوالت کی موہوم امید پر اس عظیم موقع کو ضائع کر دینے کی عظیم حماقت سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کریں۔ پھر اس ماہِ مبارک میں ہمیں اللہ کا جو قرب نصیب ہو اس کا اظہار بقیہ زندگی میں بھی عملی اصلاح اور سچی توبہ کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نظر آئے۔ اللّٰھم وفقنا لھٰذا۔ اپنی تنبیہ اور عبرت کے لیے ہمیں مستدرک حاکم میں وارد ہونے والے حضرت رسول اللہ ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کو بھی سامنے رکھنا چاہیے جس میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی اس بددعا پر آپ ﷺ نے آمین فرمایا کہ وہ شخص تباہ و برباد ہو جائے جو اپنی زندگی میں رمضان المبارک کا مہینہ پالے پھر اس میں اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ سے اپنی بخشش و مغفرت نہ کرالے۔ بقولِ شاعر:

اس آرزو کے باغ میں آیا نہ کوئی پھول　　　اب کہ بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

اللہ تعالیٰ ہم سب اس محرومی سے محفوظ فرمائے اور اپنی عنایتوں اور رحمتوں سے خوب بہرہ ور فرمائے۔ آمین

حضرت شیخ الاسلام صاحب دامت برکاتہ کے ساتھ

ایک یادگار نشست (۱)

مولانا محمد اقبال، معاون شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

آج کل یہ بات نہایت شدّ و مد کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ موجودہ دور میں اسلامی تعلیمات اجتماعی زندگی میں قابل عمل نہیں رہیں، یہ ترقی کا دور ہے، دنیا بہت آگے جا چکی ہے، اسلامی تعلیمات پرانے زمانے سے متعلق تھیں، ماڈرن دور کے تقاضے بدل گئے ہیں، اسلامی تعلیمات تیز رفتار ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ اس طرح کی باتیں عموماً دین بے زار لبرل حلقوں کی طرف سے تسلسل کے ساتھ دوہرائی جا رہی ہیں۔ جب دین سے محبت کرنے والے حضرات یہ باتیں سنتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ اسلام تو قیامت تک باقی رہنے والا دین ہے، ہر دور میں اس سے رہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اب کیا وجہ ہے کہ اسلام جدید ذہن کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ اس پروپیگنڈے کے نتیجے میں بد اعتمادی کی ایک فضا بن جاتی ہے۔ اس بد اعتمادی کی فضا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی جامعات (یونیورسٹیوں) میں اسلامیات پڑھنے والے بعض ماڈرن، جدت پسند میدان میں آجاتے ہیں اور کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ غلطی اسلام کی نہیں علماء کی ہے۔ علماء کی پس ماندگی، جدید دنیا اور اس کی ضروریات سے ناواقفیت نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے۔ اسلام کا ماڈرن لائف کا ساتھ نہ دینے کی وجہ علماء کا جمود اور اجتہاد سے انکار ہے۔ اب وہ اجتہاد شروع کر دیتے ہیں تاکہ اسلامی احکام کو ماڈرن دور کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکے۔ یہ لوگ علماء سے عوام کو بدظن کر کے اجتہاد کے نام پر کھلم کھلا دینی احکام میں تحریف کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ دین کی بالا دستی اور اس پر عمل کے بجائے اسے مغربی فکر کے تابع کرنا ان حضرات کا مقصد بن جاتا ہے۔ ان کی ساری تگ و دو کی بدولت اسلامی طرز زندگی کے بجائے مغربی فکر پر مبنی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اور اس کے برعکس ایک دوسرا طبقہ بھی پایا جاتا ہے جو علماء کو مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ وہ یہ کہ علماء جب موجودہ زمانے کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے عصر حاضر کے عملی تقاضوں کے مطابق دین کی تشریح و تفہیم کرتے ہیں، تو اس طبقے کی طرف سے توہین آمیز رویہ دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ لوگ کہنا شروع کر دیتے

ہیں کہ مولوی مغرب زدہ ہوگیا ہے، وہ مولوی کو اسلامسٹ کا لقب دیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لوگ صرف تنقید میں ماہر ہوتے ہیں، عملی طور پر ان کا کردار تقریباً صفر ہے۔

ایک سادہ لوح مسلمان کے لیے یہ بات باعث حیرت ہے، وہ سوچتا ہے آخر اس مولوی بے چارے نے کونسا ایسا ناقابل معافی جرم کیا ہے، جس کی بنیاد پر اس کے خلاف ایک محاذ کھڑا کیا گیا ہے؟ در حقیقت مولوی کا جرم یہ ہے کہ اس نے دو انتہاؤں کے درمیان اعتدال کا راستہ دکھایا ہے اور افراط و تفریط سے بچتے ہوئے صراط مستقیم پر گامزن ہے۔ بس مولوی کی یہ ادا بعض حضرات کو ناپسند ہے، کیوں کہ یہ ادا ان کی خواہشات نفسانی کی تسکین میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ان مذکورہ دونوں طبقوں میں سے اوّل الذکر طبقہ خواہشات نفسانی کا اسیر ہے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہلانا پسند کرتا ہے اور نفس کی تسکین بھی چاہتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اسے مناسب اور آسان راستہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کے نام پر اسلاف کے متعیّن کردہ اصولوں (جو اس کی خواہشات کی تسکین میں رکاوٹ ہیں) سے راہ فرار اختیار کی جائے، کیوں کہ بات در حقیقت اسلام کی نہیں اپنے نفس کی ہی ماننی ہے، اس لیے ان جدت پسندوں کے لیے ایسا کرنا ناگزیر بن جاتا ہے۔ جبکہ مولوی حرام کو حلال کرنے کی جرات نہیں کر سکتا، اس لیے اس مخصوص طبقے کا ہدف تنقید بن جاتا ہے۔ ہر مباح کو زبردستی حرام بنانے کو کار ثواب سمجھنے والا ثانی الذّکر طبقہ بھی اپنے جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے، اس کے نزدیک مُلّا اس لیے مجرم ہے کہ وہ ضرورت کے وقت دین میں موجود رخصتوں کا فائدہ عام لوگوں کو کیوں دیتا ہے۔ وہ متبادل کیوں بتاتا ہے۔ در حقیقت یہ لوگ اپنے مزاج کو دین سمجھ بیٹھے ہیں۔ اب ان کے مزاج کے خلاف جو بھی ہوگا، ان کے نزدیک ناجائز ٹھہرے گا۔

علما کے متعلق یہ دو سطحی آرا اس لیے قائم ہوئیں کہ یہ دونوں طرح کے لوگ در حقیقت علم سے تہی دامن ہیں۔ مغربی فکر کے حاملین اسی علمِ دین سے استدلال کریں گے جو ان کو مستشرقین نے مغربی یونیورسٹیوں میں سکھایا پڑھایا ہے۔ ان کے ائمہ ٔ دین ان کے اساتذہ ٔ مغرب ہیں اور دین اسلام کے متعلق ان کے اساتذہ کی سوچ یہی ہے۔ اسی کی بنیاد پر یہ حضرات اجتہاد کرتے ہیں۔ جہاں تک دوسرے طبقے کے لوگ ہیں، وہ بظاہر بہت مخلص ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حضرات کا علمِ دین اُردو کتابوں اور ترجموں سے ماخوذ ہے۔ ظاہر ہے ان کا مآ

خذ دین ہی ناقص ہے، جب کسی کی علمی سطح اتنی ناقص ہو تو لا محالہ اس کا استدلال بھی کمزور اور ناقص ہوگا، اس کے نتائجِ فکر بھی بداہتاً غلط نکلیں گے۔ البتہ ان دونوں طبقوں کے برعکس مولوی پوری زندگی علومِ دینیہ کے سمجھنے میں لگاتا ہے۔ اور اسلاف، ائمۂ مجتہدین کے اصولوں اور روایت کی روشنی میں دین کی تعبیر وتشریح کرنا صائب سمجھتا ہے۔ وہ جادۂ سلف سے ذرّہ برابر بھی انحراف گناہ تصور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک وہی دین معتبر ہے جو اسلاف نے سمجھا ہے اور جو ان سے ہمیں ملا ہے۔ یہ وہی اصول سامنے رکھ کر پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرتا ہے، جو ائمۂ مجتہدین نے مقرر کیے ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ اس میں اس کی اپنی مرضی، خواہش اور جذبے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ دین کا مطلب ہی یہ ہے کہ اپنی مرضی اور خواہش کو اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے حکم اور مرضیات کے تابع کیا جائے۔ چونکہ یہ طریقۂ کار ان دونوں طبقوں کے مزاج کے خلاف ہے، اس لیے ان کا مولوی سے ناراض ہونا اور مولوی کو ہدف تنقید بنانا، قابل فہم ہے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اسلام موجودہ زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے یا نہیں، تو یہ سوال بذات خود لغو اور فضول ہے، کیوں کہ اسلام صرف ساتھ دینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اسلام تو آگے بڑھ کر قافلۂ حیات کی قیادت وسیادت کا دعویٰ رکھتا ہے۔ چونکہ لبرل حلقوں نے میڈیا کے زور پر بڑی شدت کے ساتھ یہ پروپیگنڈا کیا، تو عام لوگوں کا اس سے متأثر ہونا قدرتی بات تھی۔ اجتماعی زندگی کے متعلق خواہ وہ حکومت وسیاست ہو یا معیشت واقتصاد کا میدان، اسلامی تعلیمات بے غبار ہیں۔ علماے کرام نے اس سلسلے میں جو جدوجہد کی ہے، وہ الحمد للہ ہر سمت میں واضح ہے۔ صرف وطن عزیز پاکستان کی تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالیں تو زندگی کے ہر اجتماعی کام میں علماے کرام کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ آزادی کے فوراً بعد دستوری مسائل ہوں یا تعلیمی مسائل، علماے کرام نے بخوبی اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی ہزاروں سفارشات، عدالتوں کے ذریعہ خلافِ اسلام قوانین کی تبدیلی اور معاشی میدان کی مشکلات کا حل تلاش کرنے میں علماے کرام نے پوری تندہی اور جان فشانی سے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ان ہی علماے کرام میں استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کا نامِ گرامی سر فہرست ہے۔ انھوں نے اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے نفاذِ اسلام کے لیے عملی جدوجہد فرمائی ہے۔ اسی طرح

معیشت کی اصلاح و تجدید کے متعلق ان کے کارنامے کی پوری دنیا معترف ہے، جس کی بدولت غیر سودی نظامِ معیشت کے قیام کا راستہ ہموار ہوا ہے۔ اس میدان میں آپ کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہے۔ غیر سودی نظام معیشت پر آپ نے ایک وقیع لٹریچر مہیا کیا ہے، جس سے سرکاری اور پرائیویٹ سطح پر بھرپور استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ الحمدللہ حضرت شیخ الاسلام صاحب دامت برکاتہم سے ایک عرصہ پہلے اس سلسلے میں ایک خصوصی نشست کا موقع ہمیں میسر آیا۔ اس میں حضرت کے ساتھ ان کی اقتصادی میدان میں کوششوں کے ساتھ ساتھ مختلف علمی موضوعات پر بات چیت ہوئی اور حضرت کی گراں قدر اور دلنشین گفتگو سے مستفید ہوئے۔

ویسے تو استاذ محترم کی عمومی مجالس اور علمی دروس میں شرکت کی سعادت پہلے ہی سے حاصل ہے، البتہ حضرت کے ساتھ ایک خصوصی نشست اور محفل کی تمنّا عرصے سے دل میں بسی ہوئی تھی تاکہ حضرت کے گراں قدر خیالات کھل کر جاننے کا موقع ملے۔ اس کے لیے میں اور میرے دوست فیض محمد صاحب نے غور و فکر شروع کیا کہ کس طرح استاذ گرامی سے وقت لیا جائے۔ اچھی خاصی سوچ بچار کے بعد یہ طے ہوا کہ ایک خصوصی دعوت کا اہتمام کیا جائے اور اس میں حضرت کو مدعو کیا جائے، اور اس دعوت کو ایک علمی محفل کا بہانہ بنایا جائے۔ اگر حضرت نے ہماری دعوت کو قبول فرمالیا تو اس طرح ایک خصوصی نشست کا موقع بھی میسر آئے گا اور حضرت کا ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہونا بذات خود ہمارے لیے سعادت کی بات ہوگی۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے ہم نے حضرت کو دعوت دی کہ وہ ہمارے ساتھ ایک وقت کے کھانے میں شریک ہوں۔ انتہائی شفقت کا معاملہ فرماتے ہوئے حضرت نے ہماری اس خواہش کو پذیرائی بخشی اور ہمیں شب ہفتہ رات نو بجے بتاریخ ۲۲ فروری ۲۰۲۰ء وقت دیا، تو ہم پر خوشی اور سرشاری کی ایک کیفیت طاری ہوگئی، کہ حضرت کا اپنے انتہائی قیمتی لمحات میں سے ہمارے لیے وقت نکالنا جہاں ہمارے لیے سعادت کی بات ہے وہاں حضرت کی کمال تواضع کی بہت بڑی دلیل ہے۔

ہفتے کی شب میں نماز عشا کے بعد فیض محمد جن کا اس محفل کے انعقاد میں فعال کردار تھا، وہ اور جنید حضرت کے گھر چلے گئے تاکہ حضرت کے ساتھ آئیں۔ ہم نے دار العلوم کے دار الاقامے (ہاسٹل) میں نشست کا اہتمام کیا تھا۔ تھوڑی دیر میں حضرت تشریف لائے، ہم نے دارعلی کے دروازے پر استقبال کیا، اور وہاں سے ہم حضرت کو لے

کر نشست گاہ آئے، محفل جم گئی۔ شرکاے مجلس میں راقمُ الحروف، یاسین مدنی، فیض، اسماعیل ہاشمی، جنید، عبد الصبور، زاہد اسلام، عثمان اور وقاص شامل تھے۔ حضرت کے ارشاد پر سب شرکا نے فرداً فرداً اپنا تعارف کرایا۔ تمام ساتھیوں کا رُخ استاذ گرامی کی طرف تھا۔ حضرت نے محفل کے آغاز میں دارالعلوم میں طلبہ کے لیے بہترین انتظامات اور مختلف سہولتوں کی دستیابی پر گفتگو فرمائی اور ہمیں ان سہولتوں پر شکر کرنے کی طرف متوجہ فرمایا۔ اس کے بعد سنجیدہ سوالات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، ہر نوع کے موضوعات پر سوال ہوتے رہے اور حضرت نہایت بے تکلفی سے ہر سوال کا جواب دیتے رہے۔

آغاز میں حضرت نے اپنے زمانۂ طالب علمی کے واقعات سنائے کہ اس زمانے میں دارالعلوم جہاں قائم کیا گیا، یہ ایک دور دراز علاقہ تھا، آبادی نہیں تھی، ریگستان تھا، بنیادی سہولتوں کا فقدان تھا۔ ہم نے کسمپرسی اور سخت حالات میں یہاں پڑھا۔ لیکن آج الحمدللہ دارالعلوم میں تمام سہولیات دستیاب ہیں۔ فرمایا: فراغت کے بعد جب میں دارالعلوم میں استاذ بنا تو میری عمر چھوٹی تھی، اس وقت میری داڑھی بھی نہیں تھی جبکہ میرے شاگرد داڑھی والے تھے، اس وقت ہم شیروانی وغیرہ پہن کر اپنا مقام قائم کرتے تھے۔ اُستاد جی جب اپنے دورِ طالب علمی کے واقعات اور اس کے بعد بحیثیت اُستاذ، دارالعلوم میں اپنے تجربات کے متعلق گفتگو سے فارغ ہوئے تو شرکاے مجلس میں سے عثمان نے کہا کہ جب آپ عدالت میں جج تھے تو اس وقت جو اہم فیصلے آپ نے کیے، اس کی روداد ہم سننا چاہتے ہیں۔ تو فرمایا: یہ بڑی دردناک داستان ہے، ضیاء الحق (اللہ ان کو غریق رحمت کریں) جب صدر بنے، تو انھوں نے ہمارے دستور میں ایک ایسا بنیادی کام کیا کہ اگر ہم اس سے فائدہ اٹھاتے، تو آج ہمارے آئین میں کوئی غیر اسلامی شق نہ ہوتی۔ انھوں نے آئین میں ترمیم کی اور یہ اختیار سپریم کورٹ کو دیا، کہ کوئی بھی غیر اسلامی دفعہ عدالت میں چیلنج کی جا سکتی ہے۔ جب میں جج بنا تو غیر اسلامی قوانین میں تبدیلی کے لیے یہ ایک بہترین موقع تھا۔ میں نے سیاسی دینی جماعتوں سے کہا آپ اپنی سیاست کرتی رہیں، مگر اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ایک قانون کا جائزہ لے کر ہمارے پاس درخواستیں لائیں، ہم غیر اسلامی قوانین میں تبدیلی کریں گے۔ اگرچہ کم سہی لیکن پھر بھی کچھ درخواستیں آئیں، جن پر ہم نے کاروائی کی اور تقریبًا دو سو غیر اسلامی قوانین تبدیل کیے۔ ایک قانون جب ختم ہوتا تھا تو لاکھوں مقدمات خارج ہوتے تھے۔ جب پنجاب

میں ''شفعے'' کے قانون کو ہم نے تبدیل کیا تو اس کے نتیجے میں ڈیڑھ لاکھ مقدمات خارج ہو گئے۔ یہ جگہیں اب بھی خالی ہیں، بعض پر لوگ ہیں مگر وہ علما نہیں ہیں، ایک آدھ اگر ہو۔ لیکن جب جج ہی خراب ہو تو اس اختیار سے مطلوبہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ جب تک ان پوسٹوں پر علماء نہ ہوں تو درخواست دینا بے کار ہے۔ گفتگو کے درمیان راقم نے ایک چیف جسٹس کا تذکرہ کیا کہ سود کے متعلق ریمارکس دیتے ہوئے انھوں نے کہا: ''سود جائز ہے یا نہیں، یہ فتویٰ مدرسوں سے پوچھیں ہم سے نہ پوچھیں''۔ تو حضرت نے فرمایا کہ مجھے تو اسی لیے نکالا تا کہ اپنی مرضی کے فیصلے حاصل کیے جا سکیں۔

جاری ہے۔۔۔

تعارفِ امام غزالی (۱)

حافظ مومن محمود

سیدنا امام محمد الغزالی علیہ الرحمہ اُمت کے اُن چندافراد میں سے ہیں کہ جن کا نام سنتے ہی ایمان میں اضافہ محسوس ہوتا ہے۔گویاسیدناامام غزالی کانام سنتے ہی دل میں ایمان کی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔آپ کی کنیت 'ابوحامد' تھی اوراسی سبب سے آپ کاپورانام ''أبو حامد محمد ابنُ محمد ابنُ محمد الغزّالي ''ہے۔اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ 'الغزالي 'ہےیا 'الغزّالي' ہے۔اِحیاءالعلوم کے شارح مرتضٰی الزبیدی نے اتحاف السادات کے نام سے احیاءالعلوم کی بیس جلدوں میں شرح لکھی ہے،ان کے نزدیک زیادہ قوی رائے یہی ہے کہ ' الغزّالی' ہے۔ان کے والد صاحب غزّال تھے اور وہاں عام رواج تھا کہ نام کی نسبت فاعل یافعل کے صیغہ مبالغہ کی طرف کردی جاتی تھی۔جیسے خیّاط کوخیّاطی،اسی طرح غزّال کوغزّالی کہہ دیاجاتا تھا۔چونکہ امام غزالی علیہ الرحمہ کے والد کاپیشہ 'غزل'(سوت کاتنے) کاتھاتواس نسبت سے ان کانام امام ' غزّالی' قرار پایا۔

سابق شیخ الازہر،امام مصطفٰی المراغی ،امام غزّالی کے متعلق فرماتے ہیں:إذا ذكر الإمام الغزّالي فأنت لست على أمام رجل واحد،کہ جب تمھارے سامنے امام غزّالی علیہ الرحمہ کاذکر ہو،توتم ایک آدمی کے سامنے نہیں ہو،بلکہ بہت سے آدمیوں کے سامنے ہو''۔مطلب یہ کہ آپ ایک ایسے اُصولی کے سامنے ہیں کہ جن سے بڑھ کرکوئی اُصولی نظرنہیں آئے گا،المنخول،المستصفى في علم الأصول، شفاءالغليل في القياس التعليل ان کی اس موضوع پر کتابیں ہیں۔جب صوفیاکی بات ہوگی توآپ ایک ایسے صوفی کے سامنے ہیں کہ جن کے مقابلے میں کوئی صوفی نہیں ہے۔فقہ میں ان کوشافعی ثانی کہاجاتاہے،ان کی کتابیں فقہ میں البسیط،الوسیط،الوجیز، الخلاصہ ہیں۔کسی نے ایک شعر میں اس طرح کہاہے:

أحسن الله خلاصة الذي الف　　　　الوسيط والوجيز والبسيط والخلاصة

'' اللہ تعالی اس کونجات عطافرمائیں کہ جس نے فقہ میں یہ چار کتابیں تحریر فرمائیں''۔اسی طریقے پرآپ دیکھیں

کہ جب علم کلام کا ذکر ہو تو امام غزالی متکلّم کی حیثیت میں بھی ہمارے سامنے موجود ہیں، اور علم کلام کے حوالے سے ان کی چھوٹی بڑی کافی کتابیں ہیں۔ الاقتصاد في الاعتقاد اسی سلسلے کی ایک جامع کتاب ہے جو انھوں نے عقیدہ اہل سنت والجماعت پر تحریر فرمائی۔ اسی طریقے پر جب باطل فرقوں سے مناظرہ کی بات ہو تو امام غزالی نے باطنیہ کا رد کیا ہے، ایک کتاب ان کی فضائح الباطنیہ ہے، دوسری کتاب المستظهري ہے جو خلیفہ مستظہر باللہ کی طلب پر انھوں نے تحریر فرمائی ہے۔ تو امام غزالی اصولی بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، آپ صوفی بھی ہیں اور متکلّم بھی ہیں۔ اور اگر فلسفے کی ایک تعریف یہ کی جائے کہ ہر وہ آدمی جو فلسفہ بیان کرے یا اس کا رد کرے وہ فلسفی کہلائے گا، تو اس اعتبار سے یہ فلسفی بھی ہیں۔ چنانچہ مقاصد الفلاسفة اور پھر اس کے بعد تهافة الفلاسفة اسی میدان علم میں آپ کے شاہ کار ہیں۔ امام منطقی بھی ہیں اور شائد علوم اسلامیہ میں منطق کو داخل کرنے میں سب سے بنیادی کردار امام غزالی کا ہے، منطق پر ان کے ہاں عمدہ کلام پایا جاتا ہے، مثلاً معیار العلم، اور مقاصد الفلاسفة کے شروع میں بھی منطق پر ایک جامع مقدمہ ہے، اسی طرح المستصفی کے شروع میں بھی منطق پر مقدمہ پایا جاتا ہے، اور فرماتے ہیں: ”جس نے علم منطق حاصل نہیں کیا تو اس کے علوم کا کوئی اعتبار نہیں ہے“۔ تو اس اعتبار سے آپ منطقی بھی ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: إنّ الغزالي كان أمتاً ”بے شک غزالی ایک امت تھے“۔

آپ علیہ الرحمہ کی پیدائش طُوس میں ہوئی۔ طُوس ایران میں ہے آج بھی طابران ایک جگہ ہے جس کے پاس طُوس پایا جاتا ہے اور امام غزالی کی قبر بھی وہاں ہے۔ اگرچہ قبر کی نسبت کے بارے میں اختلاف ہے لیکن مذکورہ جگہ پر ایک مرقَد ہے جس کی زیارت بھی کی جاتی ہے اور وہ امام غزالی علیہ الرحمہ سے منسوب ہے۔ آپ علیہ الرحمہ کے والد صاحب ایک نیک اور شریف آدمی تھے لیکن پڑھنا، لکھنا نہیں جانتے تھے۔ اللہ پاک نے انھیں دو بیٹے عطا کیے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ جب طُوس میں کسی فقیہ کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے تو یہ دعا کرتے کہ اے اللہ! مجھے ایک ایسا بیٹا عطا فرما جو فقیہ ہو اور جب کسی واعظ کی مجلس میں جاتے تھے تو کہتے کہ یا اللہ! ایسا بیٹا عطا فرما جو واعِظ بنے۔ تو اللہ تعالی نے انھیں دو بیٹے عطا کیے۔ ایک کا نام محمد رکھا جو ہمارے امام غزالی ہیں اور دوسرے احمد الغزالی جو بہت بڑے واعِظ تھے بہت سی بڑی

کتابوں میں ''أبو الفتوح'' کے نام سے ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ابھی یہ دونوں بچے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا لیکن وہ ایک صوفی کو وصیت کر گئے اور کچھ رقم دے دی کہ ان کو پڑھنا، لکھنا سکھا دینا۔ کیونکہ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ بس میرے بچوں کو پڑھنا، لکھنا آجائے جس سے وہ خود محروم تھے۔ کچھ عرصہ بعد جو محدود مال وہ دے کر گئے تھے ختم ہو گیا۔ تو صوفی صاحب نے دونوں بچوں سے کہا کہ اب میں مزید تمھاری کفالت نہیں کر سکتا۔ وہاں ایک فقیہ احمد بن محمد زاز کانی کا حلقہ درس ہے تم طالب علم بن کر وہاں چلے جاؤ تو تمھیں وہاں کم از کم دو وقت کی روٹی مل جایا کرے گی۔ امام غزّالی علیہ الرحمہ بعد میں امام حسن بصری علیہ الرحمہ کے قول سے استدلال کرتے اور فرمایا کرتے تھے: تعلمنا العلم لغير الله فأبى العلم إلا أن يكون لله کہ ہم نے ابتدا میں غیر اللہ کے لیے علم حاصل کیا تھا۔ ہمارا مقصود یہ تھا کہ وہاں جا کر کچھ روٹی مل جائے گی لیکن علم نے اللہ کے علاوہ کسی کا ہونے سے انکار کیا اور اللہ کے لیے بن گیا''۔

آپ علیہ الرحمہ کی ابتدائی تعلیم امام زاز کانی کے تحت ہوئی۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے منتقل ہو گیا اور طُوس کے بالکل قریب جُرجان تشریف لے گئے۔ جُرجان میں ابو نصر الاسماعیلی کے تحت رہے، اُن سے تعلیم حاصل کی اور اپنی پہلی تعلیق لکھی۔ اور جب جُرجان سے واپس آرہے تھے تو راستے میں ڈاکو آگئے۔ ڈاکوؤں نے امام غزّالی کا تھیلا لے لیا۔ امام غزالی علیہ الرحمہ ان کے پیچھے پیچھے جا پہنچے اور اس تھیلے کا مطالبہ کیا۔ معلوم یہ ہوا کہ اس میں امام غزالی کی وہی تعلیق تھی جو انھوں نے تحریر فرمائی۔ مطالبہ کرنے پر ڈاکو نے کہا کہ یہ کونسا علم ہے؟ کہ صحیفہ تم سے گم ہو جائے تو تمھارا علم بھی تم سے رخصت ہو جائے۔ اس موقعہ پر امام غزّالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ ڈاکوؤں نے یہ الفاظ اللہ پاک کی طرف سے ادا کیے ہیں۔ اور پھر فرماتے ہیں کہ جب میں واپس پہنچا تو تقریبًا دو اڑھائی سال سے کم اس صحیفے کو یاد کرنے میں صَرف کیے تا کہ کتابت کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے علم ضائع نہ ہو۔ اس کے بعد آپ علیہ الرحمہ نیشاپور تشریف لے گئے، جہاں اس وقت (شوافع کے نزدیک) امامُ الدنیا امامُ الحرمین، عبد المالک ابو المعالی الجوینی علیہ الرحمہ موجود ہیں۔ جن کی اُصولِ فقہ میں مشہور کتاب 'البرهان' ہے۔ وہاں امام غزالی علیہ الرحمہ کا شمار امامُ الحرمین کے خصوصی شاگردوں میں ہوا۔ جب تک امام الحرمین کی وفات نہیں ہوگئی اس وقت تک ان کے پاس رہے۔ ان سے علمُ الکلام بھی حاصل کیا، علم الفقہ اور علمِ اصول الفقہ بھی حاصل کیے۔ امام الحرمین کے بارے میں کہا

جاتا ہے کہ یہ اس وقت کے ذہین ترین افراد میں سے تھے: کان من ازکیاء العالم، بہرحال امام الجوینی علیہ الرحمہ کے ہاں آپ علیہ الرحمہ نے المنحول لکھی اور جب اپنے استاذ کو پیش کی تو وہ فرمانے لگے: دفنتنی حیاً، "تم نے مجھے زندہ ہی دفن کر دیا"۔

بہرحال کچھ علماء کا خیال یہ بھی ہے کہ المنخول اس درجے کی نہیں ہے کہ البرہان کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن المستصفی جو آپ علیہ الرحمہ نے ۵۰۳ ہجری میں اپنی وفات سے دو برس پہلے تحریر فرمائی اس کا موازنہ البرہان سے کیا جاتا ہے۔ امام الجوینی علیہ الرحمہ کی کتاب البرہان اپنے اُسلوب کے اعتبار سے المستصفی سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ امام ابنِ خَلدُون علیہ الرحمہ نے البرہان کو لغزالامۃ کہا ہے کہ یہ امت کی پہیلی ہے جسے حل کیا جائے گا۔ جبکہ اس کے بالمقابل المستصفی کا اُسلوب سہل ہے اور وہ آسان ہے۔ ابن خلدون علیہ الرحمہ کہتے ہیں المستصفی اپنے اسلوب کے اعتبار سے البرہان سے بہتر ہے۔ دیکھنے کی چیز ہے کہ المستصفی ہو یا احیاء العلوم یا دیگر چیزیں جو امام غزّالی علیہ الرحمہ نے تحریر فرمائیں، درجے کے اعتبار سے امام غزالی کے پائے کا کوئی بھی نہیں ہے۔ ابنِ خَلدُون علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ سب سے اوپر امام غزالی علیہ الرحمہ ہیں۔ جب کہ ابن تیمی علیہ الرحمہ ہ، ابن قیم علیہ الرحمہ ان سے نیچے آتے ہیں۔ اگرچہ امام غزّالی علیہ الرحمہ پر اعتراض کرنے والوں نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ ان کی عربی میں کچھ اخطاء پائی جاتی ہیں۔ عبدالغافر الفارسی علیہ الرحمہ جو نیشاپور کے امام تھے انھوں نے یہ اعتراض نقل کیا کہ امام غزّالی علیہ الرحمہ سے کچھ نحویوں نے یہ سوال کیا کہ آپ علیہ الرحمہ کی احیاء العلوم اور دیگر کُتب میں نحو کی غلطیاں پائی جاتی ہیں تو امام غزالی علیہ الرحمہ نے اعتراف کیا کہ علمِ نحو میں، میں نے کوئی کمال حاصل نہیں کیا۔ اور عین ممکن ہے کہ نحو کے اعتبار سے کچھ غلطیاں ہو گئی ہوں لیکن اگر کوئی شخص بہت بڑا نحوی بن جائے یا بہت بڑا صَرفی بن جائے لیکن جب لکھنے بیٹھے تو تحریر ردّی ہو تو یہ نہیں ہو سکتا۔ تو امام غزالی علیہ الرحمہ کی تحریر ردّی نہیں ہے بلکہ اسلوب اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بلند درجہ پر فائز ہے تو تحریر شاہد ہے کہ آپ نحو سے بے بہرہ نہیں تھے۔

جب امام الحرمین علیہ الرحمہ کی وفات ہوئی تو اسی اِثنا میں امام غزّالی علیہ الرحمہ کی شہرت اِدھر اُدھر پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ نظامُ الملک جو ملک شاہ سلجوقی کا وزیر تھا۔ اس کے ہاں بھی ان کی شہرت جا پہنچی اس کا معسکر نیشاپور سے

کچھ باہر تھا وہاں اس نے امام غزالی علیہ الرحمہ کو بلایا۔ وہاں آپ علیہ الرحمہ کے علما سے، متکلّمین سے، فقہا سے، اور اُصولیین سے مناظرے ہوئے اور امام غزالی کے مقابلے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ عبد الغافر الفارسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے پہلی بار امام غزالی علیہ الرحمہ کو دیکھا تو "كان فيه زعارة" زعارۃ کا معنٰی ہے دوسرے کو دیکھتے ہی اُسے چپ کروا دینا کہ تم جاہل ہو تمھیں کچھ پتا نہیں ہے۔ گویا امام غزّالی علیہ الرحمہ اس طریقہ پر مناظرہ فرمایا کرتے تھے۔ آپ علیہ الرحمہ کے انداز میں شدت اور سختی تھی۔ پھر فرماتے ہیں کہ جب پہلی بار دیکھنے کے بعد جب دس سالہ خَلوت کے بعد دوبارہ دیکھا تو زمین، آسمان کا فرق واقع ہو چکا تھا۔ بہر حال مناظروں میں انھوں نے شکست دی ہے پھر دو نظامیے تھے جو نظامُ الملک نے قائم کیے ایک مدرسہ نظامیہ مدرسہ نیشاپور میں اور ایک اس سے بڑا مدرسہ نظامیہ بغداد میں تھا۔ نظام الملک نے امام غزّالی علیہ الرحمہ کو بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں تدریس کے لیے متعیّن فرما دیا۔ عبد الغافر الفارسی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ جب یہ بغداد میں داخل ہوئے تو صرف ان کا لباس اور ان کی سواری چار سو دینار کی تھی۔ یعنی شان و شوکت اس درجے کی تھی اس کے علاوہ آگے بھی خدم ہیں اور پیچھے بھی خدم۔ جبکہ ڈھیروں مال بھی ہمراہ ہے جو نظام الملک کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ جس وقت آپ علیہ الرحمہ بغداد پہنچے ہیں تو یہ ۴۸۴ ہجری کا زمانہ ہے اور آپ علیہ الرحمہ کی عمر ۳۴ برس ہو چکی ہے۔ چار سال تدریس کی اور پھر دس سالہ خَلوت کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ بھی بہت دلچسپ واقعہ ہے کہ خَلوت کا دور کیسے شروع ہوا؟ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے بھائی تشریف لائے جبکہ امام غزالی علیہ الرحمہ مجلس میں پڑھا رہے تھے۔ بہت ہی شان و شوکت تھی۔ اگرچہ شان و شوکت کا ہونا ولایت کے بَر خلاف نہیں ہے۔ بہت سے اللہ والے بزرگ ایسے گزرے ہیں جن کے آگے پیچھے بہت لوگ ہوا کرتے تھے جن میں ایک بڑی مثال امام ابن حجر علیہ الرحمہ کی ہے کہ جب وہ نکلتے تھے تو بیس بندے آگے اور بیس بندے پیچھے، خود بھی سواری پر، آگے بھی سوار، اور پیچھے بھی سوار موجود ہوا کرتے تھے۔ انھی کا ایک بہت ہی لطیف قسم کا قصہ ہے کہ وہ سفر پر نکلے تو راستے میں ایک یہودی فقیر بیٹھا ہوا تھا وہ آیا اور اس نے انھیں روک کر کہا کہ تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ، " دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے"۔ اب بتاؤ کہ تم قید خانے میں ہو؟ یا میں قید خانے میں ہوں؟ یعنی میری حالت دیکھو اور اپنی

دیکھو۔ ابن حج علیہ الرحمہ رنے کیا ہی خوب جواب دیا کہ ان شاء اللہ! اللہ تعالیٰ جو نعمتیں مجھے آخرت میں عطا فرمائیں گے اس کی نسبت سے میں اس وقت قید خانے میں ہوں اور جو تمھارے لیے آخرت میں اللہ پاک نے عذاب تیار کر رکھا ہے اس کی نسبت سے تم جنت میں ہو۔ بہر حال ایسے علماء گزرے ہیں کہ جن کے پاس مال و دولت بہت تھا اور خوب شان و شوکت تھی۔ امام مالک رحمہ اللہ کے بارے میں بھی آتا ہے کہ آپ علیہ الرحمہ روزانہ ایک جوڑا بدلا کرتے تھے لیکن اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ روزانہ ایک جوڑا صدقہ بھی کرتے تھے کیونکہ جو اتار دیتے تھے اس کو صدقہ کر دیتے تھے ہم اس کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ تین سو پینسٹھ جوڑے سال میں بدلتے تھے اور بیان کرنے کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ ۳۶۵ جوڑے سال میں صدقہ کیا کرتے تھے۔ بہر حال امام غزّالی علیہ الرحمہ کے بھائی ان کی مجلس میں داخل ہوئے جبکہ امام غزّالی علیہ الرحمہ پڑھا رہے تھے تو انھوں نے یہ اشعار کہے جو امام غزّالی علیہ الرحمہ کے دل پر تیر کی طرح لگے:

أَخَذْتَ بِأَعْضَادِهِمْ إِذْ وَنُوا — وَخَلَّفَكَ الْجُهْدُ إِذْ أَسْرَعُوا

وَأَصْبَحْتَ تَهْدِي وَلاَ تَهْتَدِي — وتُسْمِعُ وَعْظًا وَلاَ تَسْمَعُ

فَيَا حَجَرَ الشَّحْذِ حَتَّى مَتَى — تَسُنُّ الْحَدِيدَ وَلاَ تَقْطَعُ

کہ تم لوگوں کے بازو کو پکڑ کر جبکہ وہ تھک گئے ہیں، انھیں کہہ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں چلو۔ لوگوں کو تو اللہ کی راہ میں چلنے کی ترغیب دے رہے ہو جبکہ خود پیچھے تھکاوٹ کی وجہ سے بیٹھ گئے ہو اور تمھارے شاگرد اللہ پاک تک پہنچنے میں تم سے آگے نکل گئے ہیں۔ گویا تمھاری حالت اس پتھر کی مانند ہے جو چھریوں کو تیز کر رہا ہے نتیجتاً چھریاں تو کاٹ رہی ہیں مگر یہ پتھر کبھی نہیں کاٹے گا۔ یعنی اس پتھر نے ان چھریوں کو تو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ دوسروں کو کاٹ سکیں لیکن یہ خود اس قابل نہیں بنا کہ خود کوئی شے کاٹ سکے۔ تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک کر رہے ہو اور خود تمھاری حالت یہ ہے کہ تم خود اللہ تعالیٰ سے دور ہو۔ یہ اشعار سن کر امام غزالی علیہ الرحمہ پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور چھ مہینے تک ان کی حالت یہ رہی کہ آہستہ آہستہ کھانا، پینا، بولنا، چالنا سب بند ہو گیا۔ تدریس کے لیے بھی لوگ آتے تھے تو خود فرماتے ہیں کہ میں بولنے کی کوشش کرتا تھا لیکن میری زبان بولنے پر قادر

نہیں تھی یہاں تک کہ مروتاً بھی میں کسی سے بات کرنا چاہتا تھا تو بات نہیں ہوتی تھی اور پھر کھانا پینا بالکل بند ہو گیا بلکہ نیند بھی ختم ہو گئی۔ بہت سے طبیب آئے اور سب نے یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ ان کے دل کو کچھ ہوا ہے یعنی کوئی قلبی واردات ہے جس کی وجہ سے یہ اب بولنے پر اور کھانے، پینے پر قادر نہیں ہیں۔ پھر آپ علیہ الرحمہ مسلسل استخارہ کرتے رہے اور اس فیصلہ پر پہنچے کہ یہ سب تدریس کے سلسلے کو خیر باد کہہ دیں ہمارے لیے بھی سوچنے کا مقام ہے کہ جس جگہ پر وہ موجود ہیں، ان کی شہرت چہار دانگِ عالم پھیل چکی ہے اور علم کے حصول کے لیے دور دور سے لوگ چلتے ہوئے ان کے پاس آ رہے ہیں۔ ایسے موقع پر سب کچھ چھوڑ کر نکل جانا یہ بس تخیل ہی کی بات ہے بلکہ شاید ہم ایسے لوگ اس کا تخیل بھی نہ کر سکیں۔ آپ علیہ الرحمہ اس موقع پر شادی شدہ بھی تھے ابو حامد اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ان کا ایک بیٹا تھا حامد جو بچپن میں فوت ہو گیا تھا اور مزید تین بیٹیاں ہیں جو امام غزّالی علیہ الرحمہ کے بعد بھی زندہ رہیں۔ تو اس موقع پر ان کی تین بیٹیاں موجود تھیں۔ آٹھ، دس سال ان کی عمر تھی۔ آپ علیہ الرحمہ نے جتنا مال موجود تھا سب اللہ پاک کی راہ میں خرچ کیا اور صرف اتنا باقی رکھا جو زادِ راہ کے طور پر استعمال کر سکیں یا اپنی بیٹیوں کے لیے اور بیوی کے لیے چھوڑ جائیں۔ پھر اپنی بیوی اور بیٹیوں کو واپس طُوس روانہ کر دیا اور خود سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ وہ عجیب و غریب سفر ہر کہ جس کے نتیجے میں وہ امام غزالی علیہ الرحمہ بنے۔ اگر وہیں پڑھاتے رہتے تو بہت بڑے عالم ہوتے لیکن شاید " حجۃ الاسلام " کا لقب انھیں حاصل نہ ہوتا۔ ہماری تاریخ میں یہ وہ آدمی ہیں جو "حجۃ الاسلام" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ گویا اگر کسی نے اسلام کی دلیل دیکھنی ہو تو وہ امام غزّالی علیہ الرحمہ کی شخصیت اور ان کی سیرت کو دیکھ لے۔

جاری ہے۔۔۔

الجماعہ کا مفہوم (۲)

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

اب ہم دوبارہ حدیث حذیفہ کی طرف آتے ہیں جس میں جماعت المسلمین کی غیر موجودگی کی صورت میں فرمایا گیا تھا:((فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرَقَ كُلَّهَا))"ان تمام فرقوں سے الگ ہو جاؤ۔۔۔"

پہلی بات یہ ہے کہ مختلف مذہبی مسالک اور فقہی مذاہب اور اصلاحی و دعوتی تحریکوں اور جماعتوں کو ان، قابلِ ہجران فرقوں پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ وہ شخصیات، ادارے یا جماعتیں جوامت کے اجماعی مواقف سے ہٹ کر بدعت اعتقادی کے مرتکب ہیں یا تاویل و تعبیر باطل کے تحت، اصلاح وانقلاب کے نام پر مسلمانوں کے مابین خون خرابے کے قائل یا فاعل ہوں وہ ان قابل ہجران فرقوں میں ضرور شامل ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حدیث میں ایک ایسی صورت حال کو فرض کر کے سوال کیا گیا تھا کہ افراتفری کے حالات ہیں اور حق واضح نہیں ہے لیکن اگر حق واضح ہے تو پھر اعتزال آسان ہے پھر صرف گمراہ فرقوں سے الگ ہو کر علمائے اہل سنت کی جماعتوں و تحریکوں سے منسلک رہنا ہے۔ اگر حالات ایسے ہوں کہ حق واضح نہ ہو، اور ہر طرف گمراہ کن یا متحارب گروہوں کا زور ہو تو پھر اعتزال کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں پہلی تو یہ کہ اگر انسان کو اپنے مبتلائے فتن و آزار ہونے کا گمان ہو تو کسی پہاڑ یا وادی یا کسی بَن میں بھی جا بسرام کیا جا سکتا ہے، حدیث کے الفاظ کے مطابق چاہے درختوں کی جڑیں چبا کر ہی گزارا کرنا پڑے۔ اور اگر صورت حال اتنی خراب نہ ہو تو ان متحارب گروہوں سے الگ ہو کر انسان عام مسلمانوں میں گھل مل کر رہے اور (يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ)"ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف پر صبر کرے" تو حدیث کے مطابق یہ بھی ایک اعلیٰ صورت ہے۔ ایسی صورت حال میں درج ذیل احادیث سے بھی راہنمائی لی جا سکتی ہے:

فَإِيَّاكُمْ وَالشِّعَابَ، وَعَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَالْعَامَّةِ وَالْمَسْجِدِ(مسند احمد)"پس گھاٹیوں میں پڑنے سے بچو اور الجماعہ

اور عامۃ المسلمین اور مسجد کو لازم پکڑو"۔فَإِذَا رَأَيْتُمُ اخْتِلاَفًا فَعَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الأَعْظَمِ (سنن ابن ماجه) "پس جب تم اختلاف دیکھو تو سوادِ اعظم کو لازم پکڑو"۔

اب تک کی ہماری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ الجماعہ کا اولین مصداق، امت مسلمہ ہے جس سے علاحدگی ارتداد کی صورت میں ہوتی ہے۔ الجماعہ کا دوسرا مصداق، وہ مسلمان قوم ہے جو مسلمان حکمران کے ماتحت منظم ہو۔ اس سے علاحدگی ارتداد و کفر تو نہیں لیکن گناہ ضرور ہے۔ اب الجماعہ کے تیسرے مصداق کی طرف آتے ہیں۔

اہلِ سنت والجماعہ

الجماعہ کا تیسرا، اطلاق امت مسلمہ میں سے ایک گروہ خاص ہے جس کا لقب اہل السنہ والجماعہ ہے۔ اگرچہ ایک مرفوع روایت میں بھی أهل السنة والجماعة کے الفاظ وارد ہوئے ہیں لیکن محققین کے مطابق اس روایت کی اسناد نامعلوم ہیں (تخریج احیاء علوم الدین) اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ أهل السنة والجماعة کا لقب، علمائے اہل سنت نے اپنے لیے اختیار کیا اور یہ الفاظ نبوی نہیں ہیں البتہ آپ ﷺ کے الفاظ سے ماخوذ ضرور ہیں۔

حدیث افتراق امت، جس میں رسول اللہ ﷺ نے یہ خبر دی کہ بنی اسرائیل کی طرح امت مسلمہ بھی کثیر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، تمام فرقے دوزخی ہوں گے سوائے ایک کے کہ یہ فرقہ ناجیہ ہو گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا: ((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي)) "وہ گروہ جو میرے طریق پر ہو گا اور میرے اصحاب کے طریق پر ہو گا" اس گروہ کے لیے ایک دوسری روایت میں الجماعہ کے الفاظ بھی آئے ہیں: ((وَهِيَ الْجَمَاعَةُ)) (سنن ابن ماجہ) جس کی روشنی میں یہ کہنا درست ہے کہ الجماعہ کا دوسرا مصداق، اہل سنت والجماعہ ہے۔

اب یہ سوال ہے کہ اہل سنت کون ہیں؟ تو اس کا اصولی جواب تو ((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي)) میں ہے لیکن یہ جواب قابل تشریح ہے۔ امام ملا علی القاری رحمہ اللہ ان الفاظ کی شرح میں لکھتے ہیں: "فرقہ ناجیہ وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی سنت کو تھامے ہوئے ہیں اور بلاشبہ یہ اہل سنت ہی ہیں"۔

علامہ مُظہری الحنفی رحمہ اللہ نے المفاتیح شرح المصابیح میں ان الفاظ کی تشریح پر بہت لطیف کلام فرمایا ہے۔

سب سے پہلے یہ سوال اٹھایا کہ نبی کریم ﷺ کس شے پر تھے۔۔۔ تو آپ ﷺ 'وحی' پر تھے۔ اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو وحی ربانی کی پیروی کا حکم دیا تھا: ﴿اتَّبِعْ ما أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ (یونس: 109) ﴿وَاتَّبِعْ مَا يُوحَى إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ (الأحزاب: 2) نبی کریم ﷺ کا طرز عمل بھی یہی تھا کہ آپ ﷺ وحی الہی کے مکمل متبع تھے۔ اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اپنا یہ طرز عمل واشگاف انداز میں بتا بھی دیں تاکہ کسی کو غلط فہمی یا خوش فہمی نہ رہے: ﴿قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَى إِلَيَّ مِنْ رَبِّي﴾ (الأعراف: 203)

اب یہ جو وحی ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو ہم وحی جلی کہتے ہیں اور یہ قرآن پاک ہے اور دوسرے کو ہم وحی خفی کہتے ہیں اور یہ سنتِ رسول پاک ہے۔ پس وحی میں کتاب و سنت دونوں شامل ہیں۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ((أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ)) (سنن أبي داؤد) "آگاہ رہو کہ بے شک مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اسی جیسی ایک اور چیز دی گئی ہے"۔ تو ((ما أنا عليه)) سے دو اصول برآمد ہوئے قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ، ان دونوں اصولوں پر کما حقہ عمل پیرا ہونے والی، نبی کریم ﷺ کی کامل پیروی کر کے آپ ﷺ کے قول و فعل کو اپنی ذات میں محفوظ کرنے والی جماعت، صحابہ کرام ﷺ کی ہے جن کی مدح و توصیف قرآن پاک میں بیان ہوئی ہے اور جن کے ایمان کو معیار ایمان قرار دیا گیا، پس جو گروہ قرآن پاک اور سنت رسول ﷺ پر، منہج صحابہ کے مطابق عمل کرے گا وہ ((ما أنا عليه و أصحابي)) کا مصداق بنے گا۔

امام ابن تیمیہ علیہ الرحمہ نے 'عقیدۂ واسطیہ' میں اہل سنت والجماعت کے اصول پر بات کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل سنت کا پہلا اصول کتاب اللہ ہے جسے وہ تمام علوم پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا دوسرا، اصول اتباع ہے اور اتباع سے مراد ہے آثارِ رسول ﷺ اور آثارِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سبیل السابقین کی پیروی کرنا ہے۔ اہل سنت کا ایک اصول اجماع ہے یعنی جو مومنین کا متفقہ راستہ ہے پس اہل سنت علم و دین کے معاملے میں تمام اقوال و اعمالِ باطنی و ظاہری کو اجماع کے پیمانے پر ماپتے ہیں۔ اصولی طور پر، اجمالی انداز میں ((ما أنا عليه و أصحابي)) کی وضاحت ہو چکی لیکن، تاریخی طور پر اور تفصیلی انداز میں اس کی معرفت و ثبوت کہ پیغمبر علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرام کن

اصول و فروع پر تھے ، ایک ضروری امر ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ معرفت کیسے حاصل ہو ؟ مولانا انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: وطريق معرفة ما أنا عليه وأصحابي توارث السلف وتعاملهم "ما انا علیہ واصحابی کی معرفت کا ذریعہ سلف کا توارث اور ان کا تعامل ہے"۔ امام ابن قیم علیہ الرحمہ اپنی کتاب "الصواعق المرسلة في الرد على الجهمية والمعطلة" میں فرماتے ہیں: يُرْجَعُ فِي مَعْرِفَةِ مَا كَانَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَصْحَابُهُ إِلَى أَهْلِ الرِّوَايَةِ وَالنَّقْلِ "جس طریقے اور منہج پر آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب تھے اس کی معرفت کے لیے ضروری ہے کہ اہل روایت اور اہل نقل کی طرف رجوع کیا جائے"۔ علامہ مبارکپوری علیہ الرحمہ نے شرح مشکاۃ میں ، علامہ ابن حزم علیہ الرحمہ کا قول نقل کیا ہے: وأهل السنة الذين نذكرهم أهل الحق، ومن عداهم فأهل البدعة، فإنهم الصحابة، وكل من سلك نهجهم من خيار التابعين، ثم أصحاب الحديث، ومن تبعهم من الفقهاء جيلاً فجيلاً إلى يومنا هذا، ومن اقتدى بهم من العوام في شرق الأرض وغربها "اہلِ سنت کو ہم اہلِ حق کہتے ہیں اور ان کے سوا جو بھی گروہ ہیں وہ اہلِ باطل ہیں اہلِ سنت والجماعہ میں ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے نہج پر چلنے والے تابعین اور پھر محدثین و فقہائے کرام اور ان کے بعد نسل در نسل ، ان کی پیروی کرنے والے علمائے کرام اور شرق و غرب میں ان کی پیروی کرنے والے عوام الناس، اہل سنت میں شامل ہیں"۔

یہ توجیہات ایک اہم چیز ہے کہ اہل سنت کا مسلک و مشرب راسخ العقیدہ علما کی سندِ متواتر و متوارث سے منتقل ہوا ہے۔ نقل کا مطلب یہ نہیں کہ محض روایتوں کو آگے منتقل کر دیا گیا بلکہ لامحالہ ، نقلِ روایت اپنے معنی و مفہوم کے ساتھ ہوا ہے۔ اسی لیے امام ابن حجر عسقلانی ، علمِ معتبر کی تعریف میں فرماتے ہیں: الْمَأْخُوذَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَوَرَثَتِهِمْ عَلَى سَبِيلِ التَّعَلُّمِ یعنی وہ علم جو انبیائے کرام یا ان کے وارثان یعنی علما سے بر سبیل تعلم ماخوذ ہو (فتح الباری) تو بطرز تعلم میں ، شاگرد کے اپنے استاد سے علم سیکھنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس بات کو ایک حدیث میں یوں بھی کہا گیا: يَرِثُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ--(السنن الكبرى للبيهقي) "اس علم کی وارث پائیں گے ہر پچھلی نسل کے عادل لوگ (اپنے اگلے لوگوں سے)"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منہج رسول ﷺ اور نہج صحابہ ، کا علم ایک مستند و معتبر ، روایت

سے ہم تک منتقل ہوا ہے۔

تعینِ اہل سنت

اہلِ سنت والجماعت کے اصولی تعارف کے بعد، اس جماعت کا تعین بھی ایک اہم امر ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ تعین کرنا ضروری نہیں ہے اور اہل سنت کے اصول کو واضح کر دینا ہی کافی ہے۔ لیکن درست بات یہی ہے کہ تعین کی اپنی اہمیت ہے کیوں کہ عام لوگ محض اصولوں سے جماعت حق کو پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے جب تک انھیں متعیّن طور پر بتانہ دیا جائے۔ اسی ضرورت کے تحت علماے کرام نے اس پر کلام کیا ہے: علامہ عبد القاہر البغدادی کی کتاب (الفرق بين الفرق وبيان الفرقة الناجية) اس موضوع کی ایک بہترین کتاب ہے۔ جس میں انھوں نے فرقۂ ناجیہ اور فرق باطلہ، دونوں کا، ان کے اصول سمیت تعارف کرایا ہے۔ علامہ صاحب اہلِ سنت کے تعین پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”اہلِ سنت کے دو بڑے گروہ ہیں، ایک اہل الرائے اور ایک اصحاب الحدیث، ان دونوں گروہوں میں فقہا، قرا، محدثین و متکلّمین پائے جاتے ہیں جو اصول دین اور عقیدے میں باہم متفق ہیں۔ البتہ فروعات میں ان کے مابین اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن ان کے یہ اختلاف، ایک دوسرے کی تضلیل و تفسیق کا ذریعہ نہیں ہیں۔ یہی فرقۂ ناجیہ ہے اور امت کا سوادِ اعظم بھی یہی ہے۔ یہ لوگ کون ہیں یہ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام اوزاعی، امام سفیان ثوری، ابو ثور بغدادی صاحبُ الشافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اجمعین، اہل ظاہر (اور ان کے متعلقین) ہیں۔ (طبع دارالافاق الجدید صفحہ ۳۰۱،۲۰)

مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ نے مزید تعین کرتے ہوئے لکھا: وبالجملة الآن مصداق الحديث اتباع المذاهب الأربعة والظاهري، وطريق معرفة ما أنا عليه وأصحابي توارث السلف وتعاملهم وإذا اختلفوا في شيء فالحق إلى الطرفين ”بہرحال اب اس حدیث کا مصداق مذاہب ائمہ اربعہ کے پیروکار اور ظاہریہ ہیں۔ ما انا علیہ واصحابی کی معرفت کا طریق سلف کا توارث اور تعامل ہے اور جب ان (یعنی مذاہبِ اہلِ سنت) میں اختلاف ہوگا تو دونوں طرف حق ہی پایا جائے گا“۔ علامہ کاشمیری رحمہ اللہ کی اختلاف والی بات کا مطلب یہ ہے کہ مذاہبِ اہلِ سنت کے مابین اختلاف فروعی اور اجتہادی نوعیت ہوتا ہے۔ جن میں مصیب و مخطی دونوں ہی اجر پاتے ہیں اور اپنے دلائل

کے مطابق دونوں فریق حق پر ہی شمار کیے جائیں گے۔[حضرت علامہ نے اس مقام پر ظاہریہ کے بارے میں کچھ اشکالات کا جواب بھی دیا ہے لیکن وہ ابھی ہمارے دائرہ بحث سے باہر ہے۔]

اصنافِ اہلِ سنت

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اہل سنت وہ گروہ ہے جو دین کی تشریح و تعبیر کے صحیح منہج پر ہے اور اس منہج کا معیار، جماعت صحابہ کرام ہیں اور یہ منہج تواتر امت سے منتقل ہوا ہے۔ اہلِ سنت نے علمِ دین کے ہر شعبے کی خدمت کی ہے۔علامہ محمد البکی الکومی (۹۶۰) نے اہل سنت کے تین بڑے گروہ بیان کیے ہیں:

السمعیّۃ: جو سمعی یعنی علوم نقلی کے ماہر ہیں ان میں کتاب و سنت اوراجماع کے جاننے والے یعنی محدثین وفقہاے کرام شامل ہیں۔

الفکریۃ: یہ اہل نظر واستدلال ہیں جو علم الکلام کے ماہر ہوتے ہیں۔ان کے دو بڑے گروہ ہیں ماتریدیہ اور اشعریہ۔

الصوفیۃ: یہ اصحاب وجد وکشف ہیں۔ جو روحانیات اور اخلاقیات کے ماہر ہوتے ہیں۔

امام عبد القاہر البغدادی نے ،الفَرق بین الفِرق ، باب پنجم، فصل اول میں علوم و فنون کے اعتبار سے، اہل سنت و الجماعت کی آٹھ اصناف بیان کی ہیں:

علم توحید یعنی علم العقیدہ یا علم کلام کے ماہرین: اس اعتبار سے اہل سنت کے دو بڑے امام پائے جاتے ہیں۔ ایک ابو منصور ماتریدی یہ چند واسطوں سے امام ابو حنیفہ کے شاگرد ہیں۔ دوسرے امام ابوالحسن الاشعری ہیں۔انھوں نے شافعی مسلک کے مختلف شیوخ مثلاً شیخ الاسلام سریج البغدادی اور ابواسحاق المروزی وغیرہم سے علم حاصل کیا۔جب باطل فرقوں کی طرف سے اسلام کے عقائد پر حملے ہونے لگے تو زیادہ تر انہی دو حضرات نے ،عقل اور نقل کے استعمال سے باطل فرقوں کا رد اور اہل سنت کے عقائد کا دفاع کیا۔ جن لوگوں نے عقائد کے ضمن میں امام ابو منصور ماتریدی کی پیروی کی وہ ماتریدیہ کہلائے اور جن لوگوں نے امام ابوالحسن الاشعری کی متابعت اختیار کی وہ اشعری کہلائے[سید سلمان ندوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب اہل السنہ والجماعہ میں حنابلہ کے نام سے ایک تیسرے ، اعتقادی مسلک کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے عقائد کے اثبات میں علم کلام کے استعمال کو درست نہ سمجھتے تھے۔ موجودہ دور کے اہل حدیث حضرات کو ان

کے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے]

علم فقہ؛ کے حاملین یعنی فقہاے کرام، جو فروعات، استنباط واجتہاد کے ماہرین ہوئے ہیں ان کے چار امام مشہور ہوئے اور ائمہ اربعہ کہلاتے ہیں اس اعتبار سے مسلمانوں میں چار مسلک پائے جاتے ہیں حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ [دور حاضر کے اہل حدیث کو حنبلیہ ہی کی توسیعی شاخ سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ زیادہ تر یہ امام ابن تیمیہ کے مسلک کا اتباع کرتے ہیں جو حنبلی المسلک تھے۔ کسی قدر انھیں ظاہریہ کے نزدیک بھی سمجھا جاسکتا ہے بہ ہر حال یہ اہل سنت کا ایک حصہ ہیں]

محدثین کرام: یہ وہ گروہ ہے جس نے احادیث و آثار اور اخبار کی روایت اور سند کی محافظت کا بِیڑا، اٹھایا، امام احمد بن حنبل، امام بخاری امام ترمذی وغیرہم اس میدان کے امام ہیں۔

ادبا: یہ وہ گروہ ہے جس نے عربی لغت اور صرف ونحو کی خدمت کی ذمے داری قبول کی سیبویہ اور خلیل وغیرہ اس فن کے ائمہ ہیں۔

جماعت قراء: یہ وہ جماعت ہے جس قرآن مجید کی خدمت انجام دی۔ ان میں سے بعض قراءات اور روایت قرآنی کے ماہرین تھے اور بعض قرآن کے معانی کے بھی ماہر تھے جو مفسرین کہلاتے تھے۔ امام نافع المدنی، عاصم الکوفی، علی بن حمزہ الکسائی، امام بن کثیر، ابن طبری، قرطبی وغیرہ اس میدان کے امام گزرے ہیں۔

جماعت زہاد: یہ وہ گروہ تھا جو مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کے ماہرین تھے انھیں صوفیاے کرام کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ابو القاسم القشیری، امام غزالی، شاہ عبد القادر جیلانی وغیرہ اس فن کے امام گزرے ہیں۔ مسالک فقہا کی طرح صوفیا کے بھی چار سلسلے ہوئے ہیں۔ ایک نقشبدی سلسلہ ہے جو امام بہاؤ الدین نقشبد کی طرف منسوب ہے۔ چشتی سلسلہ ہے جو معین الدین چشتی اجمیری کی طرف منسوب ہے۔ سہروردی سلسلہ شہاب الدین سہروردی کی طرف منسوب ہیں۔ قادری سلسلہ ہے جو شاہ عبد القادر جیلانی کی طرف منسوب ہے۔ اس فن کے ماہرین اور عوام، فقہ اور عقیدے کے ضمن میں مختلف ائمہ فقہ کی پیروی کرتے ہیں۔

مرابطون: یہ وہ لوگ ہیں جو بنیادی طور پر اسلام کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان میں عوام الناس بھی ہوتے ہیں اور دیگر اصناف کے لوگ بھی شامل ہوتے رہتے ہیں۔ [مختلف علاقوں میں مصروف پیکار، غیر تکفیری

مجاہدین اسی صنف سے متعلق ہیں۔]

عامۃ الناس: یہ مندرجہ بالا، اصناف کے ائمہ سے محبت و عقیدت رکھنے والے اور ان کا اتباع کرنے والے اسلامی عقائد و شعائر کو ماننے والے عام لوگ ہیں۔[برصغیر میں فقہ حنفی کے پیرو کار زیادہ ہیں جو، دیوبند مکتب فکر اور بریلوی مکتب فکر میں منقسم ہیں۔ اسی طرح یہاں اہل حدیث مسلک کے لوگ بھی آباد ہیں۔ جو اپنے ائمہ و علما کا اتباع کرتے ہیں۔]

امام ابن تیمیہ اہل سنت کی صفت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وَفِيهِمُ: الصِّدِّيقُونَ، وَالشُّهَدَاءُ، وَالصَّالِحُونَ. وَمِنْهُمْ: أَعْلَامُ الْهُدَى، وَمَصَابِيحُ الدُّجَى أُولُوا الْمَنَاقِبِ الْمَأْثُورَةِ، وَالْفَضَائِلِ الْمَذْكُورَةِ وَفِيهِمُ: الْأَبْدَالُ وَمِنْهُمُ: الْأَئِمَّةُ؛ الَّذِينَ أَجْمَعَ الْمُسْلِمُونَ عَلَى هِدَايَتِهِمْ وَدِرَايَتِهِمْ (العقيدة الواسطية) ”ان میں صدیقین اور شہدا، اور عام نیک لوگ ہیں، یہ ہدایت کے نشان، روشن چراغ اور اصحاب مناقب و فضائل ہیں ان میں ابدال بھی ہیں اور ائمہ بھی مسلمان ان کی ہدایت اور سمجھ پر متفق ہیں“۔ علامہ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ نے امام نووی کا قول نقل کرتے ہوئے اس طائفہ منصورہ کو اس طرح بیان کیا ہے: يَجُوزُ أَنْ تَكُونَ الطَّائِفَةُ جَمَاعَةً مُتَعَدِّدَةً مِنْ أَنْوَاعِ الْمُؤْمِنِينَ مَا بَيْنَ شُجَاعٍ وَبَصِيرٍ بِالْحَرْبِ وَفَقِيهٍ وَمُحَدِّثٍ وَمُفَسِّرٍ وَقَائِمٍ بِالْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ وَزَاهِدٍ وَعَابِدٍ وَلَا يَلْزَمُ أَنْ يَكُونُوا مُجْتَمِعِينَ فِي بَلَدٍ وَاحِدٍ بَلْ يَجُوزُ اجْتِمَاعُهُمْ فِي قُطْرٍ وَاحِدٍ وَافْتِرَاقُهُمْ فِي أَقْطَارِ الْأَرْضِ(فتح الباري) ”یہ کہنا جائز ہے کہ یہ گروہ مبارک مختلف صفاتِ رکھنے والے مومنین پر مشتمل ہے ان میں سے بعض بہادر لوگ جنگی امور کے ماہر ہوں بعض فقیہ و محدث و مفسر، اور بعض زاہد و عابد ہوں۔ بعض امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اہتمام کرنے والے ہوں، اور یہ بھی لازم نہیں ہے کہ وہ ایک ہی علاقے میں جمع ہوں بلکہ وہ کسی ایک جگہ جمع بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف علاقوں میں الگ الگ بھی پائے جا سکتے ہیں“۔

جاری ہے۔۔۔

فقهیات

القواعد الفقهية

القاعدة الأولى: الأمور بمقاصدها

قواعدِ فقهيه پر ہمارا سلسلہ وار کلام جاری ہے۔ پچھلے ماہ ہم نے القواعد الفقهية کا تعارف حاصل کیا تھا۔ اب ہم پہلے قاعدے الأمور بمقاصدها کو سمجھیں گے۔

امور، امر کی جمع ہے۔ اس کے لُغوی مفاہیم تین ہیں:

(۱) حال اور شان ﴿وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ﴾ (ہود:۹۷) (۲) اقوال وافعال ﴿وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ﴾ (ہود:۱۲۳)

(۳) کسی سے کسی کام کا مطالبہ کرنا ﴿سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ﴾ (محمد:۲۶)

مقاصد، مقصد کی جمع ہے، اس کا لُغوی مفہوم:

(۱) التوسط، مثلاً ﴿سَفَرًا قَاصِدًا﴾ (توبہ:۴۲)

(۲) استقامة الطريق سیدھا راستہ: ﴿وَعَلَى اللهِ قَصْدُ السَّبِيلِ﴾ (نحل:۹)

'مقاصد' کا اصطلاحی مفہوم

(۱) النیات، ارادے (۲) مقاصد الشريعة أي الغايات التي وضعت الشريعة لأجل تحقيقها لمصلحة العباد "مقاصدِ شریعت یعنی شریعتِ مطہرہ کی طرف سے بندوں کے مصالح کے حصول کے لیے مقرر کردہ اہداف ومقاصد"۔

مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں الأمور بمقاصدها کی وضاحت یوں سامنے آتی ہے: إن أحوال المكلفين وتصرفاتهم مرتبطة بمقاصدهم ونياتهم...فباختلاف المقاصد مختلف الأحكام المرتبة على الأعمال "مکلفین کے احوال اور تصرفات ان کے مقاصد اور نیتوں سے جڑے ہوتے ہیں، پس مقاصد اور نیّات کے بدلنے سے اعمال پر لگنے

والے حکم بھی بدلتے ہیں"۔ شریعت اسلامیہ کے قواعد عظیمہ میں سے اس قاعدہ کی اصل اور بنیاد بے شمار دلائل ہیں۔

قرآنی دلائل

(الف) ﴿وَاللهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ (البقرة:٢٢٠) اس آیت کریمہ کو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ قاعدہ "الأمور بمقاصدها" کے لیے اصل قرار دیا ہے۔(الإكليل في استنباط التنزيل، ص:٢٢٦) آیتِ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ یتیموں کے اموال کو اپنے مال کے ساتھ بقصدِ اضرار ملانا حرام ہے اور بقصد اصلاح باعثِ اجر ہے۔ یعنی یہ اختلاط بقصد اضرار ہے تو حرام اور بقصد اصلاح ہے تو باعثِ اجر ہے۔ اس مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی فعل ہے لیکن وہ نیت کے بدلنے سے کبھی حرام ہوتا ہے اور کبھی جائز بلکہ باعث اجر!

(ب) ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا﴾ (بقرہ:٢٨٦)

(ج) ﴿وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ (احزاب:٥)

ان دونوں آیات کریمہ میں ناسی اور خاطی پر عدم مؤاخذہ کی صراحت کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کا ترتب نیت اور ارادے پر ہوتا ہے اور ناسی و خاطی عدیم الارادہ ہوتے ہیں۔

(د) ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَه﴾ (بقرہ:٢٣١): "اور جب تم عورتوں کو (دو دفعہ) طلاق دے چکو تو ان کی عدت پوری ہو جائے تو انھیں یا تو حسن سلوک سے نکاح میں رہنے دو یا بطریقِ شائستہ رخصت کر دو اور انھیں تکلیف دینے کی نیت سے نکاح میں نہ رکھو کہ ان پر زیادتی کرو اور جو ایسا کرے گا، وہ اپنا نقصان کرے گا"۔

(ہ) ﴿الْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا﴾ (بقرہ:٢٢٨): "اور طلاق شدہ عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھیں اور اگر وہ اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں کہ جو کچھ اللہ نے ان کے شکم میں پیدا کیا ہے، اس کو چھپائیں اور ان کے خاوند اس مدت میں وہ ان کو

اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں، اگر ان کا اصلاح کا ارادہ ہو تو"۔

مندرجہ بالا دونوں آیات بینات میں اللہ عزوجل نے رجوع کرنے کا حق اس شخص کو دیا ہے، جس کا ارادہ اصلاح کا ہوتا ہے نہ کہ ضرر کا۔

دلائل از سنتِ رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(الف) سب سے بڑی اور عظیم الشان دلیل حدیثِ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہے، کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو سنا، آپ فرماتے تھے: ((إِنَّما الأَعمال بالنيَّاتِ وإِنما لكلِّ امرئ ما نوَى فمنْ كانتْ هجرتُه إِلى اللهِ ورسولِهِ، فهجْرتُه إلى الله ورسولِهِ، ومن كانتْ هِجرتُهُ إِلى دُنيا يصيبُها ، أَوْ إلى امرأَةٍ يَنكِحُها ، فهِجرته إلى ما هاجرَ إليهِ)) (متفق علیہ) " بے شک اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق اجر و سزا ملے گی۔ تو جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہوئی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف شمار ہوگی (یعنی اس کو جزا ملے گی) اور جس کی ہجرت دنیا کے حصول کی خاطر ہو یا کسی خاتون کے ساتھ نکاح کرنے کی غرض سے ہو تو اس کی ہجرت ان ہی کاموں کی طرف شمار ہوگی (یعنی اسے کوئی ثواب نہیں ملے گا)"۔

(ب) حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ: ((إِذَا أَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلَى أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا فَهُوَ لَهُ صَدَقَةٌ)) (بخاری) "جو شخص اپنے اہل و عیال پر ثواب کی نیت سے خرچہ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے"۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل و عیال پر انفاق میں اجر بقصد قربت حاصل ہوتا ہے، چاہے وہ نفقہ واجبہ ہو یا مباحہ۔ اور مفہوم مخالف سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ نفقہ بقصد قربت نہ ہو تو اس کا اجر میں تو کوئی حصہ نہیں ہوگا البتہ نفقہ واجبہ سے بری ہو جائے گا۔ (فتح الباري، ١/ ١٨٠)

(ج) حدیث ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی ایک اہم دلیل ہے جس کے مطابق ایک شخص رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے سوال کرتا ہے کہ ایک آدمی مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے ایک آدمی شہرت کے لیے لڑتا ہے اور ایک آدمی اپنے مرتبے کے لیے لڑتا ہے تو ان میں سے مجاہد فی سبیل اللہ کون ہے؟ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ((مَنْ قَاتَلَ لِتكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ

الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللهِ))(متفق علیہ) ''آپ ﷺ نے فرمایا جس نے قتال کیا تا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے تو وہی فی سبیل اللہ مجاہد کہلائے گا''۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''کلمۃ اللہ'' سے مراد دعوت اسلام، اللہ کی رضا کی طلب، ثواب کا حصول اور اعداے دین اسلام کی سرکوبی ہے۔(فتح الباري،٦/ ٣٦) اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ کسی بھی کام کے پیچھے متعدّد مقاصد اور نیّات ہو سکتی ہیں، اور وہ کام اللہ تعالیٰ کے ہاں اسی صورت معتبر ہو سکتا ہے جب اس کے پیچھے پایا جانے والا مقصد بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ہو پس وہی قتال اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول و معتبر اور باعث اجر و ثواب ہو گا جس کا مقصد اللہ کے کلمہ کا بول بالا کرنا ہو۔

اس قاعدے کی تفریعات

(۱) اگر کسی شخص کو راستے میں کوئی چیز ملی اور اس نے وہ چیز بر سبیل تملُّک اٹھائی تو وہ غاصب کہلائے گا، اور اس پر غصب کے احکام لاگو ہوں گے۔ مثلاً اگر وہ چیز اس کے پاس ہلاک یا ضائع ہو جائے، چاہے اس میں اس کی کوتاہی کا عمل دخل بھی نہ ہو تو بھی وہ ضامن ہو گا۔ لیکن اگر مالک کو واپس کرنے کی نیت سے اٹھائی تو اس صورت میں اگر مالک معلوم ہو تو وہ چیز اس کے پاس امانت ہو گی (یعنی ہلاک ہونے کی صورت میں اس پر ضمان نہیں ہو گا، استہلاک کی صورت میں ضمان ہو گا) اور اس چیز کو مالک کے حوالے کرنا لازمی ہے۔ اور مالک کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں وہ چیز لُقطہ شمار ہو گی۔ یعنی اٹھانے والے پر حسب حال اس کا اعلان واجب ہو گا اور جب مالک نہ ملنے کا یقین ہو جائے تو اگر وہ خود ضرورت مند ہے، تو استعمال کر سکتا ہے، ورنہ کسی حاجت مند کو دینا لازمی ہو گا۔ دونوں صورتوں میں مالک کے آنے کی صورت میں اس کا ضمان دینا مُلتَقِط (اٹھانے والے) پر لازمی ہو گا۔

(۲) اگر کسی شخص نے بارش کا پانی حاصل کرنے کی خاطر کسی جگہ کوئی برتن رکھا، تو اس برتن میں جمع ہونے والا بارش کا پانی اس کی ملک ہو گا۔ اسی طرح بر زمین یا زیر زمین بننے والے حوض میں جمع ہونے والا پانی بھی حوض کے مالک کا ہو گا۔ لیکن اگر کسی نے کوئی برتن بغیر کسی قصد و نیت کے کسی جگہ رکھا، تو اس میں جمع ہونے والا پانی اس کی ملک نہیں ہو گا، لہذا کسی غیر شخص کو اس پانی کے لینے کی اجازت ہو گی۔

(۳) اگر کسی شخص نے شکار کرنے کی خاطر اپنا جال پھیلایا تو اس میں پھنسنے والا شکار اسی شخص کا ہو گا، لیکن اگر اس نے اپنا

جال خشک کرنے کی نیت سے پھیلایا تو اس میں پھنسنے والا شکار اس کی ملک نہیں ہوگا۔ اسی طرح کسی شخص کی زمین کی کھائی میں کوئی شکار پھنس گیا تو دوسرا شخص اس کو پکڑنے پر اس کا مالک ہو جائے گا، لیکن اگر کسی نے اپنی زمین میں شکار پکڑنے کی خاطر کوئی گڑھا کھودا تو اس میں پھنسنے والا شکار کا مالک وہ خود ہوگا۔

(۴) اگر کسی شخص کے باغ میں جنگلی جانور نے گھونسلا بنا کر انڈے دیے تو وہ انڈے اس باغ کے مالک کی ملکیت نہیں ہوں گے، لہذا اگر کوئی دوسرا شخص آکر وہ انڈے یا چوزے اٹھا کر لے جائے تو مالک کو اس سے واپس لینے کا حق نہیں ہے۔ لیکن اگر باغ کے مالک نے اسی مقصد کے لیے باغ لگایا تھا کہ جنگلی جانور اس میں انڈے یا بچے دیں تو اب اگر کسی جنگلی جانور نے اس باغ میں انڈے یا بچے دیے، تو وہ انڈے اور چوزے باغ کے مالک کے ہوں گے۔

(۵) کسی مسلمان سے تین دن سے زائد کی قطع تعلقی اگر اس مسلمان کو چھوڑنے کی نیت سے ہو، تو حرام ہے۔ اور اگر اُس کے کسی جرم کی وجہ سے ہو تو حرام نہیں۔

(عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، قَالَ: «لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ، يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هَذَا وَيُعْرِضُ هَذَا، وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ» صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب الهجرة وقول رسول الله ﷺ لا يحل لرجل أن يهجر أخاه. وصحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الهجرة فوق ثلاث. ومؤطا إمام مالك، كتاب حسن الخلق، باب ما جاء في المهاجرة.)

(۶) اپنے خاوند کے علاوہ کسی دوسری میت پر تین دن سے زیادہ سوگ منانا نیت پر موقوف ہے۔ اگر ترکِ زینت وخوشبو میت کی خاطر ہے تو حرام ہے، ورنہ نہیں۔

(عن زينب بنت جحش، قالت سمعنا رسول الله ﷺ «لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تُحِدَّ عَلَى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ، إِلَّا عَلَى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا» (صحيح البخاري، كتاب الطلاق، باب تحد المتوفى عنها زوجها أربعة أشهر وعشرا. وصحيح مسلم، كتاب الطلاق، باب وجوب الإحداد في عدة الوفاة. ومؤطا إمام مالك، كتاب الطلاق، باب وجوب الأحداد. وابن ماجة، وأبو داود، والترمذي، وقال الترمذي حديث حسن صحيح.)

(۷) اگر نمازی کسی بات کے جواب میں قرآن مجید کی آیت پڑھ لے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی یا کسی خوش کن خبر کے جواب میں بطور شکر الحمدللہ کہہ دے یا کسی اندوہناک خبر کے جواب میں لاحول ولاقوۃ کہہ دے یا کسی کے مرنے کی خبر پر ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' کہہ دیا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔

(۸) اگر کوئی کپڑا فروخت کرنے والا، گاہک کے سامنے کپڑا کھولتے وقت ''سبحان اللہ'' یا '' اللهم صل علی محمد''

کپڑے کی اچھائی اور عمدگی بتانے کے لیے کہے تو گناہ گار ہوگا۔

(۹) اگر ایک مسلمان ذمی سے " أطال الله بقاؤك " اس نیت سے کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ اس کی زندگی طویل کر دے، شاید وہ اسلام قبول کر لے، یا لمبے عرصے تک ذلت اور کمزوری کے ساتھ جزیہ ادا کرتا رہے تو اس کہنے میں کوئی گناہ نہیں، کیوں کہ یہ دعا اس کے لیے اسلام کی دعا ہے یا مسلمانوں کے نفع کی۔

(۱۰) اگر کسی نے اپنے گھر میں قرآن پاک برکت کی نیت سے رکھا ہے، اس کی تلاوت نہیں کرتا تو اس کے لیے ثواب کی امید ہے۔

(۱۱) فسق بھری محفل میں کوئی شخص اس نیت سے اللہ کا ذکر کرتا ہے کہ لوگ تو فسق میں مشغول ہیں اور میں ذکر میں تو یہ افضل واحسن عمل ہے۔ اور اگر کوئی بازار میں تسبیح کرتا ہے، اس نیت کے ساتھ کہ لوگ دنیوی امور میں مشغول ہیں اور میں اللہ کی تسبیح کرتا رہوں گا، تو یہ افضل ہے اس سے کہ وہ کسی اور جگہ میں اکیلا تسبیح کرے۔

(۱۲) ودیعت کے مسئلے میں مودَع اگر ودیعت کے لباس کو استعمال کرنے کی نیت سے نکالے اور استعمال سے قبل لباس ضائع ہو جائے تو ضامن ہوگا، لیکن استعمال کی نیت نہ ہونے کی صورت میں ضامن نہیں ہوگا۔ صورت اول میں استعمال کرنے بعد محفوظ مقام پر رکھنے کے بعد ضائع ہو گیا، تب بھی ضامن ہوگا۔ کیوں کہ سابقہ نیت سے وہ لباس اس کے ضمان میں داخل ہو چکا تھا (اس کے اظہار کے بعد) حفظ کی نیت کا دعویٰ پوشیدہ امر ہونے کی بناء پر قابل قبول نہ ہوگا۔

(۱۳) اگر شوہر نے اپنی زوجہ سے اس طرح کہا " تو میرے لیے میری ماں کی طرح ہے " اگر اس کی نیت ظہار کی تھی تو ظہار ہو جائے گا، اگر عظمت و تکریم کی نیت تھی تو یہی سمجھا جائے گا، طلاق کی نیت کی صورت میں طلاق اور ایلاء کی صورت میں ایلاء ہو جائے گا کیوں کہ لفظ تمام معانی کا احتمال رکھتا ہے۔

(۱۴) مباحات کے ارتکاب میں اگر تقرب اور اطاعتِ خداوندی کی نیت ہو تو مستحق ثواب ہوگا۔ اسی طرح اگر چور نے چوری کا مال لیتے وقت اپنے قرض کی وصولی کی نیت کی تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

(۱۵) اگر کوئی اپنی زوجہ کو اجنبی عورت خیال کر کے مجامعت کرے گا یا پانی کو شراب خیال کر کے پیے گا یا وارث اپنے مورث کو معصوم خیال کرتے ہوئے قتل کرے گا تو زنا، شراب نوشی اور قتل کی نیت و قصد کی بناء پر فاسق ہو جائے گا۔

(۱۶) حفاظت کی خاطر کتاب کو ٹیک لگانا مکروہ نہیں، ورنہ مکروہ ہے۔

(۱۷)سائے کے حصول کی خاطر مسجد میں درخت لگانا مکروہ نہیں، دیگر مقاصد کے پیش نظر درخت لگانا مکروہ ہے۔

(۱۸)فعل مضارع کے استعمال میں زمانہ حال مراد لینے کی صورت میں بیع منعقد ہوجاتی ہے، استقبال کا معنی مراد لینے کی صورت میں نہیں، مثلاً بائع مشتری سے کہے "أبيعك فرسي هذا بكذا مبلغ"۔

(۱۹)نکاح مستحب اور سنت ہے، لیکن اگر مقصد ہونے والی بیوی کو ضرر اور ظلم پہنچانا ہو تو حرام ہے۔ اسی طرح اثنائے عدت میں نکاح کو باقی رکھنے اور بیوی کے حقوق کی ادائیگی کے ارادے سے رجوع کرنا اللہ کو اس کے چھوڑنے سے زیادہ محبوب ہے۔ لیکن عدت کی طوالت کی صورت میں بیوی کو ضرر پہنچانے کی نیت سے رجوع کرنا حرام ہے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَه﴾(بقرہ:۲۳۱)اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تم بیویوں کو طلاق دو اور ان کی عدت ختم ہونے کے قریب ہوجائے تو استمرار زوجیت اور بیویوں کے حقوق کی ادائیگی کو پس پشت ڈال کر ان کو ضرر دینے کی نیت سے رجوع نہ کیا کرو۔ بلکہ دو کاموں میں سے ایک کام کرو یا تو بغیر ارادۂ ضرر کے اچھے طریقے سے ان کو (رجوع کرکے) روک لو، یا پھر اچھے طریقے سے ان کو آزاد کردو، یعنی بغیر رجوع کیے ان کی عدت پوری ہونے دو:﴿وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْاوَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَه﴾ "یعنی جس نے اپنی بیوی کو ضرر دینے کی خاطر روکے رکھا تو اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کے لیے پیش کیا، کیوں کہ اس نے ظلم کا ارتکاب کیا"۔

(۲۰)کسی کام کی عدمِ مشروعیت کے باوجود اچھی نیت سے کرنے پر ثواب ملتا ہے۔ مثلاً کسی نے کوئی کام جائز اور باعثِ ثواب سمجھ کر کیا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کام شرع کے خلاف اور ناجائز تھا، تو اس کو اس ارادے اور نیت پر ثواب ملے گا، اگرچہ وہ کام جائز نہیں ہوگا اور اس کام پر اس کو ثواب نہیں ملے گا۔ مثلاً کسی نے خود کو باوضو سمجھ کر نماز پڑھی جبکہ وہ باوضو نہیں تھا، تو اس کو اس کے ارادہ نماز پر ثواب ملے گا، فعل نماز پر ثواب نہیں ملے گا۔ یا بھول سے قریب المرگ آدمی کو کسی نے احسان کرتے ہوئے لاعلمی میں زہریلا کھانا کھلایا، کھلانے والے کو پہلے سے کھانے کا زہریلا ہونا معلوم نہیں تھا۔ اور کھانے والا مر گیا تو کھانا کھلانے والے کو اس کی نیت کا ثواب ملے گا اور قتل خطا ہونے کی وجہ سے کھلانے

والے کے عاقلہ پر دیت واجب ہوگی۔

اس میں قریب المرگ کی قید کیوں ہے ؟ یوں نہیں لکھ سکتے کہ ایک شخص نے کسی پر احسان کی غرض سے زہریلا کھانا کھلا دیا جبکہ اس کا زہریلا ہونا اسے معلوم نہ تھا تو کھلانے والے کو اس کی نیت کا اجر ملے گا البتہ قتل خطا کی وجہ سے کھلانے والے عاقلہ پر دیت واجب ہوگی۔ (نوٹ) خالی نیت پر، دنیا کی زندگی میں قانونی یا انتظامی احکام جاری نہ ہوں گے۔ مثلاً کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی محض نیت کی تو نیت سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ یعنی جب تک نیت کے ساتھ کوئی فعل ظاہری اور خارجی انجام نہ دیا جائے۔

اردو کے حروف تہجی

ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ

کیا آپ جانتے ہیں اردو کے حروفِ تہجی کتنے ہیں؟

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے طے کیا کہ ہائیہ آوازوں (بھ، پھ، تھ وغیرہ) کو ظاہر کرنے والے حروف بھی حروفِ تہجی میں شامل ہیں۔ شان الحق حقی نے اردو کے حروفِ تہجی کی تعداد ترپن (۵۳) قرار دی اور مقتدرہ قومی زبان نے چون (۵۴)۔

اردو میں کتنے حروفِ تہجی ہیں؟ اس مسئلے پر مختلف آرا رہی ہیں اور آج بھی کچھ لوگ اس سوال کو اٹھاتے رہتے ہیں۔ دراصل حروفِ تہجی کا مسئلہ لسانیات اور صوتیات سے جڑا ہوا ہے اور اسی کی روشنی میں اس مسئلے کا جائزہ لینا چاہیے۔ لسانیات اور صوتیات کے ماہرین کے مطابق حروفِ تہجی دراصل آوازوں کی علامات ہیں اور ان کا مقصد کسی زبان میں موجود آوازوں کو ظاہر کرنا ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس برسوں تک یہی خیال کیا جاتا تھا کہ اردو میں پینتیس (۳۵) یا چھتیس (۳۶) حروفِ تہجی ہیں اور اس زمانے کے ابتدائی اردو قاعدوں اور بچوں کو اردو سکھانے والی کتابوں میں یہی تعداد لکھی جاتی تھی۔ البتہ بعض کتابوں میں پہلے "مفرد" حروفِ تہجی لکھ کر بعد میں "مرکب" حروفِ تہجی لکھے جاتے تھے اور یہ طریقہ بعض کتابوں میں آج بھی ملتا ہے۔ یہ مرکب حروفِ تہجی کیا تھے؟ یہ دراصل ہائیہ یا ہکاری آوازوں کو ظاہر کرنے والے حروفِ تہجی (یعنی بھ، پھ، تھ وغیرہ) تھے۔ ان آوازوں کو انگریزی میں aspirated sounds کہا جاتا ہے۔ مغرب میں جب جدید لسانیات کی بنیادیں سائنس پر استوار ہوئیں تو لسانیاتی اور صوتیاتی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ یہ ہائیہ آوازیں (بھ، پھ، تھ وغیرہ) دراصل باقاعدہ، الگ اور منفرد آوازیں ہیں۔ گویا لسانیات کی زبان میں یہ الگ فونیم (phoneme) ہیں۔ لسانیاتی تجربہ گاہوں میں مشینوں کے ذریعے کی گئی جانچ نے بھی اس نظریے کو آج تک درست ثابت کیا ہے کہ وہ آوازیں جو ہوا کے ایک جھٹکے کے ساتھ مل کر ہمارے منھ سے نکلتی ہیں (بھ، پھ، تھ وغیرہ) وہ الگ

آوازیں یا منفرد صوتیے (فونیم) ہیں اور ان آوازوں کو ظاہر کرنے والے حروفِ تہجی بھی الگ حروف سمجھے جانے چاہئیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اردو میں اوکسفورڈ کی عظیم لغت کی طرز پر ایک ایسی کثیر جلدوں پر مبنی لغت بنائی جائے جس میں اردو کا ہر لفظ ہو اور ہر لفظ کے استعمال کی سند بھی شعروادب سے دی گئی ہو۔ اس منصوبے پر ۱۹۳۰ء میں کام شروع ہوا تو پہلا مسئلہ حروف تہجی کی تعداد اور ترتیب کا تھا کیونکہ اس کے بغیر کسی لغت میں الفاظ کی ترتیب طے نہیں کی جاسکتی۔ اردو کی پرانی لغات میں عام حروف اور ہائیہ آوازوں کو ظاہر کرنے والے حروف (مثلاً ب اور بھ) میں کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا اور ان میں بعض الفاظ (مثلاً بہانا اور بھانا، بہر اور بھر، پہر اور پھر) ترتیب کے لحاظ سے ایک ساتھ ہی درج ہیں جو لسانیات کی رو سے غلط ہے اور قاری کے لیے بھی الجھن کا باعث ہے۔ لہٰذا بابائے اردو نے طے کیا کہ اردو کی ہائیہ آوازوں کو ظاہر کرنے والے حروفِ تہجی کو بھی الگ حرف مانا جائے اور لغت میں ان کی الگ تقطیع قائم کرکے ان کی ترتیب غیر ہائیہ حروف کے بعد رکھی جائے۔ مثال کے طور پر جب ''ب'' سے شروع ہونے والے تمام الفاظ کا لغت میں اندراج ہو جائے تو ''بھ'' سے شروع ہونے والے الفاظ لکھے جائیں، وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ اس طرح مولوی عبدالحق وہ پہلے لغت نویس تھے جنھوں نے ان ہائیہ آوازوں کو ظاہر کرنے والے حروف (بھ، پھ وغیرہ) کو باقاعدہ الگ حروف مان کر اردو کے حروف تہجی کی تعداد اور ترتیب درست کی۔ اردو میں ان ہائیہ حروف کی تعداد پندرہ (۱۵) ہے اور یہ بھی اردو کے حروف تہجی میں شامل ہیں۔

قیامِ پاکستان سے قبل اردو لغت کا یہ منصوبہ مکمل نہ ہوسکا۔ اس عظیم لغت کے منصوبے کو حکومتِ پاکستان نے اردو لغت بورڈ کے تحت از سرِ نو شروع کیا۔ شان الحق حقی نے بطور معتمد (سیکریٹری) بورڈ کی لغت کے منصوبے کو آگے بڑھانا شروع کیا تو علم لسانیات سے واقفیت کی بنا پر بابائے اردو کی طے کردہ اردو حروف تہجی کی تعداد اور ترتیب سے اتفاق کرتے ہوئے اردو کے ہائیہ حروف کو بھی اس میں شامل کیا۔ اس طرح عربی کے اٹھائیس (۲۸) حروف، فارسی کے مزید چار (۴) حروف (یعنی پ۔چ۔ژ۔گ)، اردو کی معکوسی آوازوں (یعنی ٹ۔ڈ۔ڑ) کو ظاہر کرنے والے تین (۳) حروف، اردو کی ہائیہ آوازوں کو ظاہر کرنے والے پندرہ (۱۵) حروف، الف ممدودہ (یعنی الف مد آ) اور ہمزہ (ء) کے علاوہ بڑی ''ے'' کو بھی الگ سے حرفِ تہجی شمار کیا کیونکہ اردو میں یائے مجہول (یعنی بڑی ''ے'') کا الگ استعمال

ہے۔اس طرح اردو کے حروف تہجی کی کل تعداد "الف" سے لے کر "ے" تک ترپن (۵۳) ہوگئی جن کو ترتیب سے یہاں لکھا جاتا ہے:

ا۔آ۔ب۔بھ۔پ۔پھ۔ت۔تھ۔ٹ۔ٹھ۔ث۔ج۔جھ۔چ۔چھ۔ح۔خ۔د۔دھ۔ڈ۔ڈھ۔ذ۔ر۔رھ۔ ڑ۔ڑھ۔ز۔ژ۔س۔ش۔ص۔ض۔ط۔ظ۔ع۔غ۔ف۔ق۔ک۔کھ۔گ۔گھ۔ل۔لھ۔م۔مھ۔ن۔نھ۔ و۔ہ۔ء۔ی۔ے

ان میں شامل حروف لھ، مھ، نھ وغیرہ باقاعدہ حروفِ تہجی ہیں کیونکہ وہ اردو کی بعض آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں۔اسی لیے ننھا، تمھارا، جنھیں اور چولھا جیسے الفاظ میں دوچشمی ھ لکھنی چاہیے ورنہ ان کا املا غلط ہوجائے گا (ان الفاظ کے املا میں دوچشمی ھ کے استعمال پر تفصیلی گفتگو پھر کبھی سہی)۔

اردو کے حروفِ تہجی کی صحیح تعداد اردو لغت بورڈ میں شان الحق حقی نے ترپن (۵۳) طے کی اور اسی ترتیب اور تعداد کی بنیاد پر اردو کی بائیس (۲۲) جلدوں پر مبنی لغت باون (۵۲) سال کی محنت شاقہ کے بعد مرتب اور شائع کی گئی۔ البتہ دور جدید میں کمپیوٹر آنے کے بعد جب مشینی کتابت میں نون غنے (ں) کی وجہ سے مسئلہ ہونے لگا تو مقتدرہ قومی زبان (جس کا نام اب ادارۂ فروغِ قومی زبان ہوگیا ہے) نے اپنے صدر نشین افتخار عارف صاحب کی نگرانی میں ایک مجلس (کمیٹی) بنائی جس نے یہ طے کیا کہ نون غنے (ں) کو بھی ایک حرف تسلیم کیا جائے تاکہ ایک معیاری (اسٹینڈرڈ) کلیدی تختے (یعنی keyبورڈ) کی مدد سے جب عالمی سطح پر اردو کو فون اور کمپیوٹر میں استعمال کیا جائے تو کوئی الجھن نہ ہو۔ اس طرح اردو کے حروفِ تہجی میں ترتیب کے لحاظ سے نون (ن) کے بعد نون غنے (ں) کا اضافہ کرنا پڑا۔ اس اضافے سے ان حروف کی کُل تعداد چون (۵۴) ہوگئی ہے اور اب اسی کو سرکاری طور پر درست تسلیم کیا جاتا ہے۔گویا اردو کے حروف تہجی کی صحیح تعداد چوّن (۵۴) ہے۔

فتاوی یسئلونک

صلوۃ التسبیح فضائل و مسائل

"عکرمہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباس بن عبدالمطلب سے کہا چچا جان کیا میں آپ کو عطیہ نہ دوں، کیا میں آپ کو ہدیہ نہ دوں۔ کیا میں آپ کو نہ بتاؤں ایسی دس باتیں کہ اگر آپ ان پر عمل کریں تو اللہ تعالی آپ کے اگلے اور پچھلے، نئے اور پرانے، ارادہ سے کئے ہوئے یا بلا ارادہ کیے ہوئے، چھوٹے اور بڑے، کھلے اور چھپے سب گناہ بخش دے؟ اور وہ دس باتیں یہ ہیں۔ کہ آپ چار رکعت نماز پڑھیں اس طرح پر کہ ہر رکعت میں سورت فاتحہ اور کوئی ایک سورت پڑھیں اور جب قرأت سے فارغ ہو جائیں پہلی رکعت میں تو کھڑے کھڑے پندرہ مرتبہ سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ پڑھیں پھر رکوع میں دس مرتبہ کہیں پھر جب رکوع سے سر اٹھائیں تب پھر دس مرتبہ یہی کلمات کہیں، پھر سجدہ میں دس مرتبہ پھر سجدہ سے اٹھ کر دس مرتبہ پھر دوسرے سجدہ میں جا کر دس مرتبہ پھر دوسرے سجدہ سے اٹھ کر دس مرتبہ یہی پڑھیں اس طرح ہر رکعت میں پچھتر مرتبہ یہ کلمات دہرائے جائیں گے پھر اسی طرح چاروں رکعتوں میں کریں۔ اگر ہو سکے تو یہ صلوٰۃ التسبیح روزانہ ایک مرتبہ پڑھ لیا کریں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہر جمعہ کو۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ہر مہینے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو سال میں ایک مرتبہ اور اگر اتنا بھی نہ ہو سکے تو کم از کم زندگی میں ایک مرتبہ ضرور پڑھ لیں"۔ (سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ التسبیح)

۔ یہ نماز مستحب ہے۔ اس نماز کی چار رکعات ہیں ان چار رکعات کے پڑھنے کا ایک طریقہ تو حدیث بالا میں موجود ہے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد ثناء پڑھ کر سبحان اللہ والحمد للہ۔۔۔ پوری تسبیح ۱۵ مرتبہ پڑھے اور پھر سورہ فاتحہ اور سورت پڑھ کر ۱۰ مرتبہ پھر تسبیح پڑھے اور دوسرے سجدے کے آخر میں پھر تسبیح نہ پڑھے۔۔ اگر تسبیحات کی تعداد یاد نہ رہے تو انگلیوں کو دبا کر ان کو یاد رکھنا جائز ہے۔۔ اگر کسی رکن میں تسبیح پڑھنا بھول جائے تو اگلے رکن میں اس کی تعداد پوری کر لے لیکن رکوع کی تسبیح قومہ میں ادا نہ کرے۔۔ صلوۃ التسبیح نفلی نماز ہے اس کی جماعت مکروہ تحریمی ہے۔۔ اگر نماز کے بعد معلوم ہو کہ تسبیحات کی تعداد مکمل نہیں ہوئی تو سجدہ سہو کی ضرورت نہیں۔ (ملخص از نماز کے مسائل کا انسائیکلوپیڈیا جلد ۳ صفحہ ۷۰ تا ۷۷)